معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰ روپے فی شمارہ ۱۲ روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰ روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷ اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ، بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 ---- Phone: (009242) 7280916 5863609

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۹ ماہ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۰۷ء عدد ۵

فہرست مضامین

email : shibli_academy@rediffmail.com : ای میل

http://Shibliacademy.blogspot.com : ویب سائٹ

شذرات

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی مسلمانانِ ہند کا مایہ ناز دینی، علمی اور تحقیقی ادارہ ہے جو ہندوستان کی عظمت اور اس کے سیکولرازم کا نشان ہے، دارالمصنفین کے قیام و بقا کی ذمہ داری مسلمانوں ہی کی طرح پورے ملک و قوم اور حکومت ہند کی بھی ہے کیوں کہ یہ اس ملک کا شاندار قومی و تہذیبی اثاثہ ہے، جن لوگوں کی نظر اس کی گزشتہ تاریخ پر ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس نے مرکزی یا ریاستی حکومتوں کی امداد اور قوم و ملت کے عطیات پر انحصار کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ پر اعتماد، اپنے بانیوں کے اخلاص اور نیک نیتی اور کارکنوں کے ایثار و قربانی کو اپنی خاص پونجی اور اپنی کتابوں کی تجارت کو اصل ذریعۂ آمدنی سمجھا اور الحمدللہ نامساعد حالات کے باوجود وہ تقریباً ایک صدی سے اپنے وجود کو قائم رکھے ہوئے ہے لیکن اس سے پہلے ان صفحات میں یہ بار بار عرض کیا جاتا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے خود غرض ناشرین اور تاجرانِ کتب دارالمصنفین کی کتابیں اس کی اجازت کے بغیر چھاپ کر اسے ختم کردینا چاہتے ہیں اور کوئی داد و فریاد، شور و احتجاج، ترغیب و ترہیب اور گزارش و فہمائش انہیں ان کی اس شنیع حرکت سے باز رکھنے میں موثر اور کارگر نہیں ہوتی، دارالمصنفین کے کارکنوں کے لئے حالات کی نامساعدت کا مقابلہ کرنا تو آسان ہے لیکن ایسے بے درد و بے رحم قزاقوں اور شب خوں مارنے والوں کا مقابلہ کرنا آسان نہیں۔

دارالمصنفین کی کتابوں کی ڈاکہ زنی اور قزاقی کا یہ سلسلہ ہندوستان اور پاکستان میں تو بہت عرصے سے جاری ہے لیکن اب عرب ملکوں میں بھی یہ سلسلہ شروع ہوگیا ہے، دارالمصنفین کی اکثر کتابیں اردو میں ہونے کے باوجود اپنے موضوع پر بہت بلند پایہ اور عہد حاضر کے ذہن و ذوق اور مزاج کے مطابق ہیں، اس پائے اور اس طرح کی کتابوں سے عربی زبان کا دامن چوں کہ خالی ہے، اس لئے اندھا دھند عرب ملکوں میں ان کے عربی ترجمے شائع ہورہے ہیں اور اس "کارخیر" میں عرب ناشرین و مصنفین کی امداد ہندوستان کے وہ اصحاب جبہ و دستار کررہے ہیں جن کا تعلق ایسی دینی درس گاہوں سے ہے جو عربی لکھنے اور بولنے میں بہت ممتاز سمجھی جاتی ہیں، ان کے شیوخ و اساتذہ اپنے تلامذہ سے چند سکوں کے عوض یہ کام کرارہے ہیں اور دارالمصنفین کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے ہیں، بلاشبہ وہ مصنف اور ادارہ بڑا خوش قسمت ہے جس کی کتابوں کے ترجمے ملک اور بیرون ملک کی زبانوں میں چھپیں، مولانا شبلی نے اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے اپنی فارغ البالی کی بنا پر خود اردو اور عربی کے علاوہ اپنی کتابوں کے انگریزی ترجمے کرائے، اب اسی طرح کے حالات عرب مصنفین و ناشرین کے بھی ہوگئے ہیں کہ ان کی

کتابوں کی جس قدر اشاعت اور ترجمے ہوں اس سے ان کو خوشی ہوتی ہے لیکن ہندوستان کے اداروں اور مصنفین خصوصاً دارالمصنفین کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ اس کے علم میں لائے بغیر اس کی کتابیں اس طرح چھپتی اور دوسری زبانوں میں ترجمے کی جاتی رہیں، اس سے تو وہ تباہی کے دہانے پر پہنچ جائے گا، اس لئے پاکستان اور عرب ملکوں یا دنیا کے کسی ملک اور زبان میں جو لوگ دارالمصنفین کی کتابیں یا ان کے ترجمے شائع کرنا چاہیں ان کے لئے اس سے اجازت لینا، معاہدے اور معاوضے کی شرائط طے کرنا ضروری ہے، عرب ملکوں میں ان مسائل کو طے کرنے کے لئے دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے ایک بہت ممتاز رکن مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری نے یہ ذمہ داری قبول کرلی ہے، اس لئے وہاں کے لوگ ان سے بات کرسکتے ہیں اور پاکستان میں دارالمصنفین کے ایک بڑے کرم فرما جناب حافظ سجاد الٰہی صاحب لاہور سے یہ امور طے کئے جاسکتے ہیں۔

ہم کو عدالتوں کے فیصلے جچے تلے اور منطق کے بجائے اگر متعصبانہ اور جانب دارانہ بھی نظر آئے، تب بھی ہم نے ان پر رائے زنی سے پرہیز کیا ہے لیکن ۵/اپریل ۲۰۰۷ء کو الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس ایس این سری واستو کی ایک نفری بنچ نے عجیب و غریب فیصلہ دے کر ہم کو لب کشائی پر مجبور کردیا، فاضل جج کے نزدیک اترپردیش کے مسلمان اب اقلیت میں نہیں رہے، اس لئے انہوں نے ریاستی حکومت کو یہ ہدایت کی ہے کہ "انہیں غیر اقلیتی فرقہ کی حیثیت عطا کرے، ملک کی آزادی کے وقت ہی طے ہوگیا تھا کہ ۵ فیصد سے کم آبادی والے فرقہ اور مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اقلیت سمجھا جائے گا لیکن آج اترپردیش میں مسلمانوں کی آبادی ۱۸ فیصد سے زائد ہوچکی ہے" ہم قانون کے طالب علم نہیں ہیں لیکن اس فیصلے کے کئی جھول ہم سے بھی مخفی نہیں رہے، کیا اب ریاستی اور ضلعی سطح پر اقلیت و اکثریت کے فیصلے کئے جائیں گے یا ملک کی آبادی کی بنیاد پر، عدالتوں کے اپنے حدود اور دائرے ہیں، وزیراعظم نے بھی ان کو اسی حد کے اندر رہنے پر زور دیا، مسئلہ صرف یہ تھا کہ ایک مدرسہ نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ مدرسوں کی مالی امداد کے سلسلے میں مساوات برتنے کے لئے ریاستی حکومت کو ہدایت جاری کرے مگر عدالت نے پوری ریاست کے مسلمانوں کو اقلیتی زمرے سے خارج کردیا، اترپردیش کے موجودہ وزیراعلیٰ نے بالکل بجا فرمایا کہ مسلمانوں کو اقلیتی درجہ دئے جانے کا اختیار ریاستی حکومت کو ہے نہ کہ ہائی کورٹ کو، سچر کمیٹی سے مسلمانوں کو تھوڑی بہت امیدیں بندھی تھیں کہ ان کے دن پھریں گے مگر اس فیصلے نے تو جڑ ہی کاٹ دی، گو ڈویژن بنچ نے فیصلے پر روک لگادی ہے مگر اس سے جو کاری زخم لگ چکا ہے وہ مندمل نہ ہوگا،

مسلمان بہت سوچ سمجھ کر عدالتوں میں جائیں ورنہ اسی طرح کے الٹے سیدھے فیصلے سنیں گے۔

بی جے پی اپنے کو ایک اصول پسند، منظم اور ایمان دار جماعت کہتی تھی مگر اقتدار کا لطف اور مزہ اٹھانے کے بعد اور اب اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے وہ جو گل کھلا رہی ہے اس سے اس کی اصول پسندی اور ایمان داری کا سارا بھرم جاتا رہا، جب کلیان سنگھ نے غیر آئینی طور پر بی ایس پی کے باغی ممبروں کو پناہ دی اور واجپئی جی سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے بے تکلف فرمایا کہ ''کیا ایمان داری کا ٹھیکہ بی جے پی نے لے رکھا ہے'' جب اس پارٹی کے سب سے بڑے آدمی کا یہ حال ہے تو اس کے دوسرے اور تیسرے درجے کے لیڈروں کا کیا حال ہوگا جن کے ہاتھوں میں اب اس کی زمام کار بھی آگئی ہے، مسلمانوں کی ایذا رسانی اور ان کے خلاف زہر افشانی کرکے اس نے ہمیشہ اپنی سیاسی دکان چمکائی ہے، اترپردیش کے انتخابات میں اپنی کامیابی کے امکانات موہوم دیکھ کر مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو مشتعل کرنے اور فرقہ وارانہ کشیدگی بھڑکانے کے لئے اس نے ایک سی ڈی جاری کی، تاکہ سارے ہندو ووٹ اس کی جھولی میں چلے جائیں لیکن جب انتخابی ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کے الزام میں اس پارٹی کی منظوری رد کئے جانے کا مسئلہ اٹھا تو تمام شواہد و حقائق کے باوجود اس نے بڑی ہٹ دھرمی اور بے شرمی سے اپنی جاری کردہ سی ڈی ہی سے انکار کردیا، ابھی اس کے ایک رکن پارلیمنٹ مسٹر کٹار اور گجرات میں پولس انکاؤنٹر کے جو واقعات سامنے آئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پاکی داماں کی حکایت بڑھانے والی پارٹی کے دامن اور بند قبا پر کتنے داغ دھبے ہیں، اگر اترپردیش کے ووٹروں کی ناعاقبت اندیشی سے یہ پارٹی برسر اقتدار آتی ہے تو اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہوگی۔

۲۸؍ مارچ ۲۰۰۷ء کو علامہ شبلی توسیعی خطبہ دینے کے لئے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل علی گڑھ کے جنرل سکریٹری اور کانفرنس گزٹ کے مدیر پروفیسر ریاض الرحمان خاں شروانی ادارۂ علوم اسلامیہ کے پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی کے ہمراہ دارالمصنفین اعظم گڈھ تشریف لائے اور ''مدارس اسلامیہ کے نصاب کا مسئلہ علامہ شبلی نعمانی کے حوالے سے'' کے موضوع پر ایک پر مغز مقالہ پڑھا جس میں بتایا کہ گو مدارس اسلامیہ کا اصل مقصد دینی علوم کی ترویج و اشاعت ہے مگر عصری علوم حاصل کرکے جہاں وہ اپنی معاشی حالت کو بہتر بنا سکتے ہیں وہاں اس کی بدولت وہ اپنے دین کی بھی بہتر اور مفید خدمت انجام دے سکتے ہیں، اجلاس کی صدارت انجمن یونی ورسٹی میں حدیث کے پروفیسر مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری نے فرمائی، یہ تینوں حضرات دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے باوقار رکن ہیں۔

☆☆☆☆☆

مقالات

ادبی تحقیق کی روایت میں مولانا شبلی کی اولیت

از:- ڈاکٹر شمس بدایونی☆

اس عنوان پر گفتگو کرنے سے پیشتر یہ وضاحت کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ادبی تحقیق مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کو محقق تسلیم نہیں کرتی، یہی نہیں بلکہ اردو کے کسی بھی بڑے محقق نے ادبی تحقیق کے ظہور و شیوع میں بھی ان کی حصہ داری کا ہنوز اعتراف و اظہار نہیں کیا ہے(۱)، ''بڑے محقق'' سے میری مراد صرف رجحان ساز اور روایت ساز محققین سے ہے، جن میں سردست صرف چار پانچ نام ہی پیش کیے جاسکتے ہیں، حافظ محمود شیرانی (ف ۱۹۴۶ء)، مولانا امتیاز علی خاں عرشی (ف ۱۹۸۱ء)، قاضی عبدالودود (ف ۱۹۸۴ء)، رشید حسن خاں (ف ۲۰۰۶ء) اور پروفیسر نذیر احمد (پیدائش ۱۹۱۵ء)۔

عصر حاضر کے محقق رشید حسن خاں نے مولانا شبلی کی بابت لکھا ہے:

''انیسویں صدی کا آخری حصہ اور بیسویں صدی کا ابتدائی حصہ دراصل حالی و شبلی کا عہد تھا، اس زمانے میں ادبیات کی دنیا میں ان دونوں کے اثرات شریک غالب کی حیثیت سے کارفرما رہے اور ان کے انتقال کے کچھ دن بعد تک یہ اثرات اسی طرح کام کرتے رہے، مولانا شبلی کی خوش مذاقی، انشا پردازی اور آگہی سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے مزاج میں رومانیت کا غلبہ تھا، جس کا اثر ان کے انداز استدلال میں نمایاں ہے، بات پر اصرار اور بت گری و پرستش کا جذبہ ان کے یہاں ہمیشہ

☆ ۵۸، نیو آزاد پورم کالونی، عزت نگر، بریلی، ۲۴۳۱۲۲۔

کارفرما رہا، ان کی عبارت میں بھی ان عناصر کی جلوہ گری ہے.......... ان کے یہاں تحقیقی سطح پر شک کرنے اور چھان بین کرنے کا رجحان کم تھا، مختصر یہ کہ وہ ناقد تھے، انشاپرداز تھے، خوش مذاق تھے اور اس صفت خاص میں بہت کم لوگ ان کے شریک نکلیں گے لیکن وہ "محقق" نہیں تھے، تحقیق جس کم یقینی، غیر جذباتی انداز فکر و انداز اظہار اور صحیح معنوں میں سنگ دلی کی طلب گار ہے، یہ چیزیں ان کے حصے میں کچھ کم آئی تھیں"۔ (ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ، ص ۱۴۲)

رشید حسن خاں کے مذکورہ صدر بیان کے بعد راقم الحروف کے اختیار کردہ عنوان (ادبی تحقیق کی روایت میں مولانا شبلی کی اولیات) کی کیا کچھ بھی وقعت رہ جاتی ہے؟

یہ غور طلب ہے کہ مولانا شبلی نعمانی اپنے تمام تر ذوق تحقیق، مورخانہ شعور و آگہی، مختلف علوم و فنون پر فاضلانہ دست رس، تصنیفی و تالیفی مہارت، نادر موضوعات کا انتخاب، مواد کی ترتیب و تنظیم، عالمانہ استدلال، نایاب و کم یاب مراجع و مصادر کی تلاش و شناخت جیسی خصوصیات اور بعض صورتوں میں امتیاز رکھنے کے باوجود کیا ابتدائی دور کے محققین کی صف میں بھی جگہ پانے کے مستحق نہیں؟ اس صورت حال کی بہ ظاہر پانچ وجوہ معلوم ہوتی ہیں:

۱- پہلی وجہ پروفیسر خلیق احمد نظامی (ف ۱۹۹۷ء) کے بہ قول یہ ہے:

"اسلامی ہندوستانی تاریخ کو مسخ کرنے کا کام جب خطرناک حد تک پہنچ گیا تو اصلاح حال کے لئے بعض مصنفین نے اپنا قدم اٹھایا، پُرفریب ذہنوں نے ان کے دلائل پر غور کرنے کے بجائے اس سارے لٹریچر کو جوابی اور معذرت آمیز کہہ کر اس کی اہمیت کو کم کردیا اور مطالعے سے پہلے ہی ان مصنفین کے انداز تحقیق کو مشتبہ بنادیا"۔ (شبلی بحیثیت محقق (معارف مارچ ۱۹۸۶ء) بہ حوالہ دارالمصنفین کی تاریخ، ج ۱، ص ۱۲۹)

۲- دوسری وجہ شعر العجم (۱۹۰۸-۱۹۱۰ء) پر حافظ محمود شیرانی کی احتسابی تنقید کے اثرات مابعد ہیں، جس نے مولانا شبلی کو بہ ظاہر تحقیق کے میدان سے باہر لا کھڑا کیا، شیرانی صاحب نے شعر العجم کی صرف دو جلدوں (تعداد صفحات ۳۵۶+۳۰۲=۶۵۸) کا احتساب ۶۱۰ صفحات

پر کیا تھا، جو پہلی بار "تنقید شعر العجم" کے نام سے ۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی اردو ہند دہلی سے شائع ہوا، اس سے پیشتر یہ احتساب انجمن کے رسالے "اردو" میں قسط وار شائع ہوتا رہا تھا (اکتوبر ۱۹۲۲ء تا جنوری ۱۹۲۷ء)، اس احتساب کا اثر یہ ہوا کہ مولانا شبلی کے معرفین بھی یہ لکھنے پر مجبور پائے گئے کہ وہ بنیادی طور پر تحقیق کے مرد میدان نہیں تھے، ادب میں وہ صرف نظریاتی اور عملی تنقید کے بنیاد گزاروں میں ہیں، اس معنی میں وہ محقق نہیں جس معنی میں شیرانی نے انہیں تصور کیا، بایں سبب ان کے یہاں تحقیقی تسامحات کی تلاش بے معنی ہے، اس طرح گویا محمود شیرانی کے جملہ اعتراضات اور گرفت کو من و عن قبول کرلیا گیا، حالاں کہ شعر العجم کے جن بیانات، جس طریقہ استدلال اور مصادر و مراجع پر شیرانی نے عموماً گرفت کی تھی، اس سے مشابہ بیانات و مصادر ان کی اپنی تحقیقی کتاب "پنجاب میں اردو" (بار اول ۱۹۲۸ء) میں در آئے ہیں، جن کی گرفت رشید حسن خاں نے کی ہے (ملاحظہ کریں، ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ، ص ۶۸ تا ۷۴)، انہوں نے اس کتاب کی بابت واضح الفاظ میں لکھا ہے:

"یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیرانی صاحب نے اس کتاب میں غیر معتبر حوالوں کو بھی بلاتکلف قبول کرلیا ہے، بیاضوں اور موخر تصانیف کی بنیاد پر جس کلام کا انتساب درست سمجھا گیا ہے، تحقیق کے نقطہ نظر سے وہ نادرست ہے، شیرانی صاحب نے تو پنجاب میں اردو کا مولد ثابت کرنا چاہا تھا اور اس کے لئے انہوں نے ہر طرح کے ماخذ سے کام لیا، یہ انداز تحقیق کم اور جذباتی زیادہ تھا"۔ (حوالہ سابق، ص ۲۹۴)

ادب میں مولانا شبلی کی تحقیقات پر عدم توجہ کی بڑی وجہ یہ بھی رہی کہ ان کو سرسید کے حریف کے طور پر پیش کیا جانے لگا، اس سلسلے میں مولوی عبدالحق (ف ۱۹۶۱ء)، محمد امین زبیری (ف ۱۹۵۸ء)، شیخ محمد اکرام (ف ۱۹۷۳ء)، ڈاکٹر وحید قریشی وغیرہ نے مولانا شبلی کی علمی عظمت کو مشتبہ بنانے اور ان کی عالمانہ شخصیت کو مجروح کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور یہ سلسلہ ادبی حدود سے تجاوز کر کے کردار کشی تک جا پہنچا، ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے:

"ایسے شواہد موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مضمون (مراد

تنقید شعر العجم) مولوی عبدالحق کی فرمائش پر لکھا گیا تھا، مولوی صاحب کا علامہ شبلی سے دل صاف نہیں تھا، اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مولوی صاحب سرسید اور حالی کے زبردست حامی بلکہ عاشق تھے، اس کے برعکس مولانا شبلی کو سرسید اور حالی دونوں سے بعض معاملات میں اختلاف تھا، سرسید سے یہ اختلاف زیادہ تھا، مولوی عبدالحق نے مولانا شبلی پر مضمون لکھ کر (لکھوا کر) چھاپنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان پر ایک ایسا الزام بھی لگایا جس سے آج تک علامہ کو بریت حاصل نہیں ہوسکی ہے"۔ (حرف آغاز مشمولہ شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں، ص ۷)

خود مولوی عبدالحق نے "خطوط شبلی" کے مقدمہ میں لکھا ہے:

"مولوی شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہوگئی ہے، زمانہ کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکتا، وہ بہت سخت مزاج ہے مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ ہے، ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گی"۔ (خطوط شبلی، ص ۳۶)

۱۹۲۵-۲۶ء کا یہ بیان کس قدر غیر ذمہ دارانہ ہے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں، اسی طرح کی کوششوں نے سرسید و مولانا شبلی کے معتقدین کے درمیان ایک مستقل کشمکش کی بنیاد رکھ دی، مولانا حالی و مولانا شبلی کے بعد اس عہد پر سب سے طاقت ور اثر مولوی عبدالحق کا تھا، ان اثرات سے مولانا شبلی کی علمی مقبولیت کو کچھ نہ کچھ نقصان تو پہنچنا تھا سو پہنچا۔

۳- تیسری وجہ مولانا شبلی کی جانب اردو کے بلند پایہ محققین کا ملتفت نہ ہونا ہے، غالب و اقبال، سرسید و پریم چند کی طرح مولانا شبلی کو اردو تحقیق میں ایک مستقل موضوع کی صورت میں ابھی قبول نہیں کیا گیا ہے، یونی ورسٹیز میں لکھے جانے والے علمی مقالوں اور دار المصنفین کے رفقا کی علمی تحریروں کے علاوہ بلند پایہ اور نام ور محققین کی کتب تو کجا مضامین بھی ان پر نہ ہونے کے برابر ہیں، جب کہ مولانا شبلی سے کم تر درجے کے ادیبوں و شاعروں پر ہمارے محققین نے قلم فرسائی کی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ (۲)

۴- چوتھی وجہ یہ ہے کہ ادبی تحقیق کی تقریباً ایک صدی پر مشتمل روایت کا سلسلہ وار

تاریخی مطالعہ و جائزہ ابھی تک نہیں لیا جا سکا ہے، اس صورت میں یہ کس طرح طے پائے کہ تحقیق کی گذشتہ ایک صدی کتنے ادوار پر مشتمل تھی؟ کس دور کے مصنفین کے تحقیقی رجحانات کیا تھا؟ تحقیق کے کون سے اصول کس دور میں رائج ہوئے؟ کس دور کے مصنف کا تصور تحقیق کیا تھا؟ اور اس کی تصانیف میں تحقیق کے کون سے عناصر کام کر رہے تھے؟ کن اصولوں کو اس نے کب اور کیوں اختیار کیا تھا؟ یہ اصول علم کی کس شاخ، کس شعبے سے اخذ کئے گئے؟ یہ اور اسی قسم کے متعدد سوالات ہنوز تشنہ مطالعہ ہیں۔

۵- پانچویں وجہ جو میرے نزدیک سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ مولانا شبلی کے علمی کام کو ان کے اپنے عہد کی علمی و تحقیقی روایت کے پس منظر میں نہیں دیکھا گیا، ہم دور حاضر کے دریچوں سے ماضی کا منظرنامہ دیکھنے کے عادی ہوچکے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہمیں سو برس پرانے کاموں میں تحقیق و تفحص کی جگہ، رومان و پرستش کی کارفرمائی نظر آتی ہے، ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ ہر عہد کے اپنے فکری و فنی انداز و اطوار، تقاضے اور حدود ہوتی ہیں، اس کا اپنا مزاج، ماحول، اقدار اور روایت ہوتی ہے، اس کے اپنے معلوم مآخذ اور ان سے استفادے کے طریقے ہوتے ہیں، اس کا اپنا ذہنی معیار اور طلب ہوتی ہے، کیا شبلی کی تحقیقات کا جائزہ لیتے وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھا گیا؟ "تنقید شعر العجم" اور اسی نوعیت کی دوسری تحریروں کو دیکھنے کے بعد اس امر کا شدید احساس ہوتا ہے کہ شبلی کی تحقیقات کا کہیں موخر ماخذات اور کہیں تحقیق کے موخر اصولوں کی بنیاد پر رد کیا گیا، پروفیسر نذیر احمد نے اپنی کتاب "حافظ محمود شیرانی، تحقیقی مطالعے" کے پیش لفظ میں قدرے احتیاط کے ساتھ لکھا ہے:

"محقق یا مورخ کے پیش نظر جو ماخذ نہ ہوں اور اگرچہ ان مآخذ کی روشنی میں ان کے نتائج ناقص ہوں تو اس سے مورخ و محقق پر اعتراض لازم نہیں آتا، ہمارے محققین اکثر اس نکتہ سے غفلت برتتے ہیں، شیرانی صاحب کی تحریروں میں بعض جگہ ہمیں یہ نقص نظر آتا ہے، اگر یہ نکتہ پیش نظر ہو تو تحقیق میں جو تلخی پیدا ہوجاتی ہے وہ ختم ہوجائے"۔ (ص ۷)

بیسویں صدی کے نصف دوم میں فن تحقیق کو ادب میں پذیرائی حاصل ہوئی، اب تک

کی معلومات کے مطابق فن تحقیق پر پہلی کتاب ۱۹۶۸ء میں بمبئی سے باسم ''مبادیات تحقیق'' شائع ہوئی تھی جس کے مصنف عبدالرزاق قریشی (ف ۱۹۷۷ء) تھے لیکن ماہنامہ ''آج کل''، دہلی کے تحقیق نمبر (اگست ۱۹۶۷ء) کو ادبی تحقیق کے فن کو مدون و مشتہر کرنے کا نقطۂ آغاز مانا جاسکتا ہے، مبادیات تحقیق (۱۹۶۸ء) سے تحقیق شناسی (۲۰۰۳ء) تک تقریباً دو درجن کتب ادبی تحقیق اور تدوین کے فن پر مرتب و شائع ہوچکی ہیں لیکن اکثر کا تعلق پی ایچ ڈی کے لئے لکھے جانے والے علمی مقالوں سے ہے، ان میں قابل ذکر کتب نصف درجن سے زیادہ نہیں، دوسری زبانوں کے بالمقابل اردو کے جن محققین کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں وہ بھی چھ یا سات سے زیادہ نہیں، مثلاً حافظ محمود شیرانی (اردو تحقیق کے معلم اول)، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، رشید حسن خاں، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر حنیف نقوی وغیرہ، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کیا محمود شیرانی سے قبل اردو تحقیق کا رجحان بالکل مفقود تھا؟ یا تنقید کی طرح اس کے نقوش بھی علمی و ادبی کتابوں میں موجود تھے، کیا تحقیق صرف مذہبی اور تاریخی کتب تک محدود تھی؟ کیا مذہبی، تاریخی اور سوانحی تحقیقات ادبی تحقیق کے زمرے میں نہیں آتیں؟ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ تحقیق بجائے خود ایک عمل ہے، جس کا ظہور تاریخ میں بھی ہوسکتا ہے اور سوانح میں بھی، مذہبی علوم بھی اس کے دائرہ کار میں آسکتے ہیں اور زبان ولغت بھی، تنقید میں بھی اس سے کام لیا جاسکتا ہے اور کسی کتاب کی ترتیب و تدوین میں بھی، تحقیق، حقائق و معلومات کو کچھ اصولوں اور ضابطوں کی روشنی میں پرکھ کر پیش کرتی ہے اور ان نتائج تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے جو کسی شخصیت یا فن پارے کی افادیت کو حقیقت واقعہ کی بنیاد پر مستحکم کرتے ہیں اور علمی و ادبی روایت کے دھارے سے جوڑتے ہیں، اسی سلسلے کی دوسری بات یہ ہے کہ اردو میں تحقیق کو ایک باقاعدہ اور علاحدہ فن کے طور پر قبول کرنے کا رجحان مغرب سے لیا گیا اور آج اس نے ایک مستقل بالذات فن کی حیثیت حاصل کرلی ہے لیکن تحقیق کے نقوش ہمارے مذہبی علوم میں پہلے سے موجود تھے، خصوصاً حدیث اور فن اسماء الرجال میں تحقیق کے بغیر دو قدم بھی آگے نہیں بڑھا جاسکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ تحقیق کی بعض اصطلاحات دراصل حدیث و رجال ہی کی اصطلاحات ہیں، اس صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ شبلی تحقیق کے عمل سے ناواقف محض ہوں، پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمدن وترقی

کے دور میں جو چیزیں علم وفن کی شکل اختیار کرلیتی ہیں ان کا ہیولی بہ قول مولانا شبلی:

''پہلے سے موجود ہوتا ہے اور تمدن کے زمانے میں وہ ایک موزوں قالب اختیار کرلیتا ہے اور پھر ایک خاص نام یا لقب سے مشہور ہوجاتا ہے''۔

(الفاروق، ص ۲)

تحقیق اور اصول تحقیق کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، سرسید و شبلی کے عہد میں ان کی حیثیت ایک ہیولی کی سی تھی لیکن بعد میں جب ان اصولوں کو ایک خاص شکل میں ترتیب دیا گیا تو اس کا نام تحقیق پڑ گیا۔

مولانا شبلی کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اپنے تصنیفی عمل میں استدلال اور اثبات مدعا کے لئے تحقیق کے کچھ ایسے اصولوں اور ضابطوں سے کام لیا جو اس عہد کے کسی دوسرے مصنف کے یہاں تواتر و اہتمام کے ساتھ نظر نہیں آتے، یہ اصول و ضابطے ہی آج ادبی تحقیق کی اولین روایت قرار دیے جاسکتے ہیں، تاریخی طور پر ان میں سے بعض شبلی کی اولیات ہیں، سطور ذیل میں ان پر اجمالاً روشنی ڈالی جارہی ہے:

ماخذ و مواد کی تلاش و تفتیش: ہر مصنف کتاب کی تصنیف سے پیشتر متعلقہ ماخذ و مواد جمع کرتا ہے، اس کے بعد قلم اٹھاتا ہے لیکن شبلی نے اس سلسلے میں یہ پیش قدمی کی (باستثنائے سرسید احمد خاں) کہ عربی و فارسی کے علاوہ دوسری غیر ملکی زبانوں کے علمی کام کو بھی ترجیحاً پیش نظر رکھا یا کم از کم اس سے واقفیت حاصل کی، مواد و ماخذ کی تلاش میں علمی سفر کیے، ملکی اور غیر ملکی کتب خانوں کی خاک چھانی، ارباب علم کے ذاتی ذخیروں کی چھان بین کی، علمی استفادے کے لئے دوسری غیر ملکی زبانیں سیکھیں (۳)، عالم اسلام اور یورپ میں شائع ہونے والی ہر نئی کتاب کو حاصل کیا، مواد کی تلاش اگر مکمل نہ ہوسکی تو اپنے تصنیفی کام کو موخر کردیا، اس سلسلے میں ان کی اپنی تحریروں سے متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، ''سیرۃ النعمان'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''المامون'' کے بعد میں نے ''الفاروق'' لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتدبہ حصہ لکھ بھی لیا تھا لیکن بعض مجبوریوں سے چندروز کے لئے اس تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا، اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں، حالاں کہ بات

اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لئے نہایت ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں ابھی تک پوری چھپ کر آنہیں چکیں۔ (ص ۳)

سیرۃ النعمان ہی کے دیباچہ میں عربی، فارسی، ترکی زبانوں میں امام ابوحنیفہؒ کی سوانح پر ۲۷ کتب کی فہرست دی ہے، حاشیے میں لکھا ہے:

"روم و مصر کے سفر میں مذکورہ بالا فہرست کی اکثر کتابیں میری نظر سے گزریں لیکن مہتمم بالشان اور مفید معلومات کے لحاظ سے کوئی کتاب ایسی نہ نکلی جس سے میری ناچیز تالیف میں معقول اضافہ ہوسکتا"۔ (ص ۱۰)

سفرنامہ روم و مصر و شام میں ایک سرخی ہے "کتب خانہ خدیو"، اس سرخی کے تحت کتب خانہ کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے عربی زبان کے ۳۲ علوم پر مشتمل کتب کی موضوع وار تعداد دی ہے جس کی میزان ۱۴۷۰۵ ہے (ص ۱۷۸) بعد میں تفسیر، حدیث، تاریخ اور ادب میں نادر و نایاب کتابوں کی کتب خانہ میں موجودگی سے مطلع کیا ہے اور کتب کے نام تحریر کیے ہیں، اسی سفرنامہ میں لکھا ہے:

"اسلامی دنیا کے جن حصوں میں آج تعلیم و تعلم کا چرچا ہے وہ ہندوستان عرب، مصر، شام، بلاد مغرب، فارس و ایران ہیں، ان میں سے اکثر مقامات کا علمی سرمایہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جو نہیں دیکھا ہے وہ ایسے قوی وسائل سے معلوم ہے کہ دیکھنے کے برابر ہے"۔ (ص ۷۷)

مکاتیب میں نادر و نایاب کتب، مخطوطات وغیرہ کا کثرت سے ذکر آیا ہے، صرف چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

کتابیں یہاں عجائب و غرائب ہیں لیکن حسرت کے سوا کچھ حاصل نہیں، نہ نقل ہوسکتی ہیں، نہ حافظہ ان کے لئے کافی ہی ہے، ہر روز دو تین میل پیادہ سیر کرتا ہوں، کیوں کہ کتب خانے دور دور واقع ہوئے ہیں...... ترکی پڑھنی میں نے شروع تو کی ہے، دیکھیے پوری بھی کرسکتا ہوں یا نہیں"۔ (خط نمبر ۲، بنام شیخ حبیب اللہ، مکاتیب شبلی، جلد ۱، ص ۱۲)

مولوی سید علی صاحب کے کتب خانہ میں عربی مطبوعات یورپ دیکھ کر میں سخت حیرت زدہ

ہوگیا ہوں، علمی زمین نے اپنے خزانے اگل دیے ہیں، کیا کہوں اپنے علما کی بد قسمتی اور اپنی مفلسی پر افسوس آتا ہے۔ (خط نمبر ۳۲، بنام حبیب الرحمان خاں شروانی، مکاتیب شبلی، جلد ۱، ص ۱۳۲)

ہاں مرزا کامران کا دیوان، اکبری کتب خانہ کا نہایت مستند دیکھا، شاہ جہاں اور جہاں گیر کے خاص ہاتھ کی تحریر ہے، میں نے فوٹو لیا اور متعدد کاپیاں کرائیں کہ اور شوقینوں کے بھی کام آئے۔ (خط نمبر ۶۰، بنام شروانی، جلد ۱، ص ۱۵۹)

اعجاز خسروی کا ایک عجیب و غریب نسخہ ہاتھ آیا، امیر کی وفات کے دس برس بعد کا لکھا ہوا ہے، نہایت صحیح اور سرتاپا محشی ہے اور کمال یہ کیا ہے کہ لفظی رعایت میں ایک لفظ کے کئی ٹکڑے میں بھی کوئی رعایت ہے تو اس قدر ٹکڑا سرخ لکھا ہے، مثلاً باغ کی رعایت میں "بو" کا لفظ آگیا ہے تو "بو" کو سرخ لکھا ہے، تمام کتاب میں یہ التزام ہے، اس قدر دیدہ ریزی شاید خود مصنف نے کی ہو۔ (خط نمبر ۸۹، بنام شروانی، جلد ۱، ص ۱۸۹)

سیرت کے لئے ایشیاٹک سوسائٹی میں بعض کتابیں دیکھی ہیں، انگریزی کتابوں سے جس قدر اقتباسات ہو رہے ہیں، ان سے کذب و افترا کا عجیب منظر سامنے آجاتا ہے۔ (خط نمبر ۱۰۲، بنام شروانی، جلد ۱، ص ۲۰۰)

آج وہ حمائل لے لی، دو سو پچاس نذرانے کے دیے، کل ۴۲ برس کا ہے، تاہم ایک چیز ہے ایران کا خاتم الخطاطین احمد تبریزی تھا، آغا خاں اول کے بھائی نے اس کو ایران سے بلوا کر لکھوایا تھا، اول سے آخر تک مطلّا ہے، یعنی ہر سطر پر طلائی ٹکڑے ہیں اور تقطیع نہایت موزوں ہے۔ (خط نمبر ۱۱۷، بنام شروانی، جلد ۱، ص ۲۱۱)

شبلی کے معاصر خواجہ غلام الثقلین (ف ۱۹۱۵ء) کا حسب ذیل بیان اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ وہ مواد کی تلاش و تفتیش میں کس قدر حساس تھے، وہ لکھتے ہیں:

"شکستہ یا مصنف ایک ایک واقعے کی چھان بین کے لئے کبھی لکھنؤ ہوتا تھا اور کبھی کلکتے کے لئے بادیہ پیما، کبھی مطبوعات جدیدہ کی کھوج میں بمبئی پہنچتا تھا اور معاً کتب قدیمہ کی تلاش میں کبھی مشرق میں بانکے پور اور کبھی حیدرآباد کا رخ کرتا تھا، ضعیف البصر مصنف ایک بوریے پر اس طرح آرام کرتا تھا کہ داہنے بائیں،

سرہانے یا پائینتی کتابوں کا انبار ہوتا تھا، بوسیدہ اور کرم خوردہ اوراق اس کے ہاتھ میں ہوتے تھے، صبح کے دھندلے نور سے شام کی تاریک روشنی تک پائے نگاہ اوراق کہنہ کے سیکڑوں میل کا روزانہ سفر طے کرتے تھے اور پھر نہیں تھکتے تھے''۔
(کسوف الشمسین، ص ۳۵)

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی جو شبلیات کے ماہر کے طور پر پہچان بنا رہے ہیں، انہوں نے اپنی کتاب میں شبلی کے اس وصف کا متعدد جگہ ذکر کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مولانا نے مقدمہ ہی میں ''یورپین تصنیفات'' کا عنوان قائم کرکے اسلام اور پیغمبر اسلام سے متعلق اہل مغرب کے عہد بہ عہد افکار و خیالات پر روشنی ڈالی ہے ...... اس ضمن میں مولانا نے مستشرقین کی ان کتابوں کی فہرست بھی پیش کی ہے جن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ '' ان میں سے اکثر ہمارے دفتر تصنیف میں موجود ہیں یا ہم ان سے متمتع ہو چکے ہیں'' راقم عرض کرتا ہے کہ یہ ۳۷ کتابیں ہیں، ان کا زمانہ تصنیف ۱۸۱۵ء سے ۱۹۰۹ء تک کے عرصے کو محیط ہے، ان کے مصنفین میں ۱۶ کی وطنی نسبت انگلستان سے ہے، ۷ کی جرمنی سے، ۷ ہی کی فرانس سے، ۲ کی ہالینڈ سے، ایک کا وطن اٹلی ہے اور ایک کی وطنی نسبت مذکور نہیں''۔ (مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار، ص ۴۷)

یہ حقیقت ہے کہ اگر شبلی کی جملہ تصانیف و مقالات کے مصادر و مآخذات کی فہرست سازی کی جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے درست لکھا ہے:

''شبلی کی شخصیت میں ''ذوق تحقیق'' اور ''ذوق جمال'' کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، ان کی علمی زندگی کے یہ بنیادی محرکات تھے، ان کا ذوق تحقیق ماخذ کی تلاش میں ان کو سرگرداں رکھتا تھا، وہ عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن ہر زبان کی علمی کوششوں سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے، یورپین زبانوں کے لٹریچر سے واقفیت نہ صرف اس لئے ضروری تھی کہ مستشرقین کی پیدا کی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا جا سکے بلکہ اس لئے بھی کہ جدید انداز تحقیق سے پوری طرح آگاہی

ہو سکے''۔ (فکر و تحقیق، شبلی نمبر، ص ۱۰۵)

حوالوں کا فٹ نوٹ میں اندراج: شبلی سے پیشتر کے مصنفین اور شبلی کے معاصرین جب کسی کتاب کا حوالہ دیتے تھے تو کتاب اور اس کے مصنف کے نام کے اندراج کو کافی سمجھتے تھے، یہ حوالہ بھی متن کا حصہ ہوتا تھا، شبلی نے حوالوں کا اندراج فٹ نوٹ میں کیا، جلد نمبر اور صفحہ نمبر لکھنے کا بھی اہتمام کیا، مقام اشاعت سے بھی مطلع کیا، دیباچوں میں اہم ماخذات کی فہرست اور طریقہ ترتیب پر بھی روشنی ڈالی، اگرچہ حوالہ نویسی کے جدید طریقوں کے مطابق شبلی کے حوالوں میں جہاں تہاں کچھ کھانچے نظر آتے ہیں لیکن ان کے اپنے عہد میں جب حوالوں کو درج کرنے اور اہتمام کے ساتھ ان سے مطلع کرنے کا رواج ہی نہیں تھا شبلی نے اپنی تصانیف و مقالات میں اس کا التزام کیا، مثال میں ان کی تصانیف کے قدیم اڈیشن دیکھے جا سکتے ہیں۔

راوی اور روایت: ادبی تحقیق کا یہ بنیادی مسئلہ ہے کہ ''راوی'' یا ''روایت'' کی حیثیت کیا ہے؟ معتبر، نامعتبر یا مشکوک، اسی پر مصنف کے استدلال اور اس کے نتائج کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، اگر راوی یا روایت مشکوک ہے تو مصنف کے استدلال اور بیانات کو غیر اطمینان بخش اور رد و قبول کے درمیان معلق تصور کیا جائے گا اور اگر نامعتبر ہے تو استدلال اور نتائج کو سرے سے رد کر دیا جائے گا۔

شبلی نے اپنی تلاش و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے دوران بڑی حد تک مذکورہ امور پر غور کیا ہے، ان کے عہد میں چوں کہ فن تحقیق کے اصول وضع نہیں ہوئے تھے اور نہ عملی تحقیق کا اردو میں کوئی نمونہ ہی موجود تھا جس سے اصول تحقیق کے اطلاق کی جہت طے کی جا سکے، لے دے کے سرسید اور حالی کے نمونے تھے جن سے کچھ کچھ روشنی حاصل کی جا سکتی تھی باقی سناٹا، لہذا انہوں نے خود ہی اپنی تحقیقات کا نظام مرتب کیا اور اپنی تصنیفات پر اس کا اطلاق کر کے عمل تحقیق کے ابتدائی انداز و اسلوب کو متعارف کرایا، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے:

''انہوں نے مغرب کے ان اصولوں کو قبول کیا جو اس تحقیقی میدان میں راہبر و رہنما کا کام انجام دے سکتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اصول اسناد اور اسماء الرجال کی اس طرح تشریح کی کہ جدید تحقیقات کے اصول اس کے دامن

میں سما گئے"۔ (فکر ونظر، شبلی نمبر، ص ۱۱۱)

لہذا ان کی تحقیقات کو آج کے اصول تحقیق اور معیار پر پرکھنا ایک طفلانہ بھول ہوگی۔

شبلی کے موضوعات کا دائرہ وسیع تھا، مذہب، تاریخ، ادب، فلسفہ، کلام، نصاب و نظام تعلیم وغیرہ، ان میں بیشتر کا تعلق واقعات اور روایت سے تھا، واقعات منتشر اور متضاد روایتیں بہ کثرت مگر نفس مضمون کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف، ان میں اول صحت دوم تطبیق پیدا کرنا اور سلسلہ وار ان کو ایک لڑی میں پرونا ایک دشوار گزار مرحلہ تھا، یہ مرحلہ راویوں کو پرکھے اور روایتوں پر نقد و جرح کیے بغیر طے کرنا ممکن نہ تھا، لہذا شبلی نے اپنی بساط بھر راویوں کو پرکھا اور روایتوں کی تنقیح کی، انہوں نے "الفاروق" کے حصہ اول کی تمہید میں "واقعات کی صحت کا معیار" عنوان سے لکھا ہے:

"واقعات کے جانچنے کے صرف دو طریقے ہیں، روایت و درایت، روایت سے یہ مراد ہے کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کے ذریعے بیان کیا جائے جو خود اس واقعے میں موجود تھا یا اس سے لے کر اخیر راوی تک روایت کا سلسلہ متصل بیان کیا جائے، اس کے ساتھ تمام راویوں کی نسبت تحقیق کیا جائے کہ وہ صحیح الروایۃ اور ضابط تھے یا نہیں، درایت سے یہ مراد ہے کہ اصول عقلی سے واقعہ کی تنقید کی جائے"۔ (ص ۱۱، ۱۲)

درایت کے جن اصولوں کو انہوں نے اس کتاب میں اپنے لئے منتخب کیا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

۱- واقعہ مذکورہ اصول عادت کی رو سے ممکن ہے یا نہیں؟

۲- اس زمانہ میں لوگوں کا میلان عام واقعہ کے مخالف تھا یا موافق؟

۳- واقعہ اگر کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے ثبوت کی شہادت زیادہ قوی ہے یا نہیں؟

۴- اس امر کی تفتیش کہ راوی جس چیز کو واقعہ ظاہر کرتا ہے، اس میں اس کے قیاس اور رائے کا کس قدر حصہ شامل ہے؟

۵- راوی نے واقعہ کو جس صورت میں ظاہر کیا، وہ واقعہ کی پوری تصویر ہے یا اس امر کا احتمال ہے کہ راوی اس کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا اور واقعہ کی تمام خصوصیتیں نظر میں نہ آسکیں۔

۶- اس بات کا اندازہ کہ زمانے کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقہ ادا نے روایت میں کیا کیا اور کس کس قسم کے تغیرات پیدا کردیے ہیں۔ (الفاروق، ص ۱۵، ۱۴)

تحقیق کے مرحلے میں انہوں نے واقعات میں سلسلہ علت و معلول کو بھی تلاش کیا اور نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کے معیار پر بھی نظر رکھی، روایت کو درایت کی کسوٹی پر بھی پرکھا اور روایت میں قیاس کی حیثیت پر بھی توجہ دی، مقدمہ سیرۃ النبی کو اگر ملاحظہ کیا جائے تو ان کی تحقیقات کے بعض اصولوں سے واقف ہوا جاسکتا ہے، سید سلیمان ندوی نے مقدمہ کے آخر میں سیرۃ النبی میں اختیار کردہ طور تحقیق کو "نتائج مباحث مذکورہ" کے عنوان سے ۱۰ شقوں میں درج کیا ہے جن میں مولانا کے اختیار کردہ اصول تحقیق بھی آگئے ہیں۔

علمی تحقیق کے ساتھ ساتھ شبلی کا ہدف مستشرقین کا رد بھی تھا، اس لئے ان کے دلائل و استناد کی نوعیت نفس مضمون کے لحاظ سے بدلتی رہتی تھی، مثلاً سیرۃ النبی، الجزیہ، حقوق الذمیین، الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی اور اسکندریہ میں وہ روایت کو درایت کی کسوٹی پر پرکھنے پر زیادہ زور دیتے ہیں لیکن سوانحات میں وہ درایت سے بہت زیادہ کام نہیں لیتے، بعض جگہ وہ اپنے ممدوح کے فضائل میں کم تر درجے کی روایتیں بھی قبول کرلیتے ہیں لیکن اس کا اظہار بھی کردیتے ہیں۔

تحقیق کے بنیادی طور پر دو مرحلے ہیں، انکشاف حقائق اور استخراج نتائج، شبلی دونوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بعض مقامات پر انہوں نے اپنے اصل موضوع کو پیش نظر رکھا اور اس سے متعلق ضمنی مسائل پر جم کر تحقیق نہیں کی، بعض اختلافی مسائل میں بھی انہوں نے فیصلہ کن رائے دینے سے اجتناب کیا، سنین کے اندراجات کے اختلافات تو درج کردیے لیکن محاکمہ کرنے سے احتراز کیا اور مرجح صورت وحیثیت سے مطلع نہیں کیا لیکن اس طرح کی فروگذاشتیں ضمنی مسائل میں ہیں نفس مضمون میں نہیں۔

مختصر یہ کہ راوی اور روایت کی صحت جو آج ادبی تحقیق کا ایک اہم سوال بن چکی ہے، اردو ادب میں پہلی مرتبہ شبلی ہی نے اسے موضوع گفتگو بنایا اور اپنی تصنیفات کے دوران اس پر

سوالات قائم کیے۔

تحقیق منسوبات (۴): منسوبات ایک جدید تحقیق اصطلاح ہے، جس کے تحت مجہول و مجہول کتب سے متعلق بحث کی جاتی ہے، اس اصطلاح کے تحت شعرا کا مخلوط کلام، جعل، سرقہ، الحاق، التباس، انتحال اور اسی نوعیت کے دوسرے اشکالات و تسامحات کو کوئی منہاج اور اصول طے کرکے رفع کیا جاتا ہے، اس فن کے علما میں مقدار و معیار کے لحاظ سے محمود شیرانی، ڈاکٹر غلام مصطفی خاں اور پروفیسر نذیر احمد کے نام ممتاز ہیں، یہ عجیب اتفاق ہے کہ شبلی کو اس میدان میں بھی فضیلت تقدم حاصل ہے، شبلی نے الغزالی (۱۹۰۲ء) میں امام غزالی سے منسوب چار کتب کے انتساب کا ''امام غزالی کی مجوث فیہ تصنیفات'' کے عنوان سے اجمالی جائزہ لیا ہے، رجال و تاریخ کی کتب میں ان چاروں کتابوں کو امام صاحب کی تصانیف میں شمار کیا گیا ہے لیکن شبلی نے ان تصانیف کے مضامین کو امام صاحب کے معتقدات، نظریات اور منصب و حیثیت سے بعید خیال کرتے ہوئے ان پر تعریض کی اور داخلی شہادتوں کی بنیاد پر کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی، اس طرح کی منسوب کتب اور ان سے متعلق مسائل کو شبلی کس طرح حل کرتے تھے، ذیل کی مثال سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

سر العالمین: ہمارے نزدیک یہ کتاب بے شبہ جعلی ہے، اس کی طرز عبارت اور انداز تحریر امام صاحب کے طریقہ تحریر سے بالکل الگ ہے، جعل بنانے والے نے ایک چالاکی یہ کی ہے کہ جابجا امام الحرمین کی استادی کا ذکر کیا ہے اور اپنی دانست میں اس کتاب کے اصلی ثابت کرنے کی یہ بڑی تدبیر خیال کی لیکن صرف یہی ایک امر کتاب کے جعلی ہونے کی کافی دلیل ہے، امام صاحب کی یہ خاص عادت ہے کہ وہ اپنے اساتذہ اور شیوخ کا مطلق ذکر نہیں کرتے، ان کی تصنیفات میں بہت سے ایسے مواقع ہیں جہاں استاد یا شیخ کا ذکر کرنا ضروری تھا لیکن وہ بالکل پہلو بچا جاتے ہیں اور تصریح کا کیا ذکر کنایہ تک نہیں کرتے، منقذ من الضلال میں نہایت ضروری موقع پر صرف اس قدر کہہ کر رہ گئے کہ شیوخ سے جس طرح میں نے تعلیم پائی، اس کے مطابق مراقبے اور مجاہدے میں مشغول ہوا۔ (الغزالی، ص ۴۴)

تدوین متن: اردو میں عالمانہ تدوین کی عمر بہت مختصر ہے، اس کی باقاعدہ ابتدا محمود شیرانی

اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے کی، بعد میں دوسرے محققین نے بھی تدوین متن کے کام کیے، آج تدوین کا فن اردو میں تحقیق کی ایک شاخ کے طور پر متعارف ہے اور موجودہ دور میں اس فن کے سب سے بڑے عالم رشید حسن خاں (ف ۲۰۰۶ء) اور پروفیسر نذیر احمد شمار کیے گئے ہیں، قابل ذکر بات یہ ہے کہ تاریخی طور پر اس میدان میں بھی تقدم کی فضیلت شبلی ہی کو حاصل ہے، اگرچہ تدوین متن کے سلسلے میں اولین روایت کے طور پر سرسید احمد خاں (ف ۱۸۹۸ء) کی مرتب کتب آئین اکبری (طبع اول ۱۸۵۶ء)، تاریخ فیروز شاہی (اول ۱۸۶۲ء)، توزک جہاں گیری (اول ۱۸۶۴ء) کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن ان تینوں کا تعلق فارسی زبان سے ہے، اب تک کی دریافت کے مطابق اردو زبان میں تدوین کی اولین روایت شبلی کا مرتبہ تذکرہ ''گلشن ہند'' ہے۔

گلشن ہند شعرائے اردو کا قدیم تذکرہ ہے جو علی ابراہیم خاں کے فارسی تذکرے گلزار ابراہیم (سال تالیف ۱۷۸۴ء) کا اردو ترجمہ ہے، اسے مرزا علی لطف (ف ۱۸۲۲ء) نے جان گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء میں اردو میں تالیف کیا، یہ صرف ترجمہ نہیں بلکہ حذف و اضافہ معلومات کے لحاظ سے ایک علاحدہ تذکرے کی صورت اختیار کر گیا ہے، گلزار ابراہیم میں شامل ۳۲۰ شعرا میں سے اس میں صرف ۶۸ شعرا کو شامل کیا گیا ہے، لطف کا اپنا ترجمہ بھی شامل ہے، اس طور گلشن ہند میں شامل شعرا کی تعداد ۶۹ ہو گئی ہے۔

۱۳۲۰ھ / ۳-۱۹۰۲ء میں حیدر آباد کی موسی ندی کی طغیانی میں بہتا ہوا گلشن ہند کا قلمی نسخہ مولوی غلام محمد مددگار کیبنٹ کونسل دولت آصفیہ کی ملکیت میں آیا، انہوں نے اسے شبلی کی خدمت میں پیش کر دیا اور بہ قول عبداللہ خاں:

> ''علامہ موصوف نے اس کو بدرجہ غایت پسند کیا اور انجمن اردو کی طرف سے شائع کرنے کا قصد کیا لیکن انجمن اپنی پیچ در پیچ طرز عمل کی وجہ سے اس کو نہ چھاپ سکی اور علامہ موصوف نے ہم کو اس کے شائع کرنے کی رائے دی اور خود اس کے ایڈٹ کرنے کا وعدہ کیا، چنانچہ علامہ موصوف نے اس کی تصحیح بھی کی اور اس پر کچھ نوٹ بھی لگائے جو بجنسہ چھاپ دیے گئے ہیں''۔ (پبلشر کی التماس، مکتوبہ ۱۶؍ نومبر ۱۹۰۶ء)

اس وقت شبلی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے (۵)، (۴؍ نومبر ۱۹۰۳ء تا دسمبر ۱۹۰۵ء)

انجمن اپنے محدود وسائل کے سبب اسے شائع نہ کرسکی ، بعد میں عبداللہ خاں ذمہ دار کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد نے ۱۹۰۶ء میں رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سے چھپوا کر حیدرآباد سے مع دیباچہ لطف و مقدمہ مولوی عبدالحق اسے شائع کردیا ، تذکرے پر شبلی کی کوئی تعارفی تحریر نہیں ہے ، پروفیسر نثار احمد فاروقی (تلاش غالب ، ص ۲۹۶) اور رفاقت علی شاہد (تحقیق شناسی (۶) ، ص ۱۵) نے تذکرے پر شبلی کے مقدمے کی اطلاع دی ہے جو غلط ہے۔

گلشن ہند کا دوسرا اڈیشن محی الدین قادری زور (ف ۱۹۶۲ء) نے مرتب کیا ، انہوں نے گلزار ابراہیم اور گلشن ہند دونوں کو یکجا ترتیب دیا ، یہ دونوں تذکرے یکجا طور پر مع مقدمہ عبدالحق بر تذکرہ گلشن ہند اور مع مقدمہ محی الدین قادری زور بر تذکرہ گلزار ابراہیم اور بدون دیباچہ لطف بر گلشن ہند ، ۱۹۳۴ء میں مطبع مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے چھپ کر شائع ہوا ، اس کے شروع میں طبع اول پر شامل عبداللہ خاں کی تحریر بہ عنوان "پبلشر کی التماس" کو برقرار رکھا گیا ہے ، (مکتوبہ ۱۶ نومبر ۱۹۰۶ء) لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس پر سرورق طبع اول کا چسپاں ہے جس سے بادی النظر میں یہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ طبع اول ہی ہے ، بعض قلم کاروں کو تسامح بھی ہوا ہے ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے رسالہ نگار کراچی (مئی جون ۱۹۶۴ء) کے "تذکروں کا تذکرہ نمبر" میں لکھا ہے:

"گلزار ابراہیم کو ۱۹۰۶ء میں گلشن ہند کے ساتھ عبداللہ خاں نے حیدرآباد دکن سے شائع کیا ، اس میں مولوی عبدالحق اور محی الدین قادری زور دونوں کے مقدمات شامل ہیں ، مولوی صاحب کا مقدمہ گلشن ہند میں اور زور کا مقدمہ گلزار ابراہیم پر ہے ، یہ تذکرہ دراصل زور کا مرتب کیا ہوا ہے ، اس میں انہوں نے گلشن ہند اور گلزار ابراہیم دونوں کی عبارتیں درج کردی ہیں اور جہاں کہیں اختلاف ہوا ہے اسے واضح کردیا ہے"۔ (نگار - تذکروں کا تذکرہ نمبر ، ص ۳۷)

۱۹۰۶ء میں محی الدین قادری زور کا اسے ترتیب دینا کیوں کر ممکن ہوسکتا ہے ، جب کہ ان کا سال پیدائش ۱۹۰۴ء ہے (تذکرہ ماہ و سال ، ص ۱۸۰) ، دراصل طبع دوم پر دو سرورق استعمال کیے گئے تھے ، ایک سرورق پتنگی کاغذ پر چسپاں کیا گیا تھا جس پر مرتب کی حیثیت سے سید محی الدین قادری زور کا نام درج تھا اور دوسرا سرورق طبع اول کے مطابق تھا ، ایسا معلوم ہوتا

ہے کہ پتنگی کاغذ کا سرورق کمزور ہونے کے سبب جلد ضائع ہوگیا اور طبع اول کا سرورق باقی رہا جو تسامح کا سبب بنا ، راقم الحروف نے طبع اول اور طبع دوم کے بھی دونوں نسخوں کو دیکھا ہے ، سطور آئندہ میں طبع اول کے حوالے ہی سے گفتگو کی جائے گی۔

شبلی کے مرتبہ گلشن ہند پر تفصیلی مضمون ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی صاحب نے لکھا ہے ، اس مضمون میں انہوں نے تصحیح متن و تحشیہ نگاری کے سلسلے میں شبلی کی کاوشوں کا جائزہ لیا ہے اور کثرت سے مثالیں درج کی ہیں ، انہوں نے لکھا ہے:

"گلشن ہند کی تصحیح و تدوین میں علامہ شبلی نے کن اصولوں کو پیش نظر رکھا تھا ، اس کی انہوں نے کہیں وضاحت نہیں کی ہے ، البتہ ان کے قلم سے جو حواشی و وضاحتی نوٹ ہیں ان سے طریقہ تصحیح و تدوین کا اندازہ کسی قدر ضرور ہوتا ہے اور اس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے ہی تحقیق و تدوین کے اصولوں سے بڑی حد تک کام لیا ہے ، انہوں نے اصل سے (۱) تحقیق و مراجعت بھی کی ہے اور (۲) وضاحتی و تشریحی نوٹ بھی لکھے ہیں (۳) بعض اضافے بھی کیے ہیں (۴) املا کی تصحیح بھی کی ہے ، اس کے علاوہ (۵) مفید علمی و تنقیدی حواشی لکھے ہیں ، ان ہی پانچ بنیادی امور سے تذکرہ گلشن ہند مزین ہوکر طبع و اشاعت کی منزل سے گزرا۔ (تذکرہ گلشن ہند اور علامہ شبلی نعمانی ، ہماری زبان دہلی ، ۲۲ ، ۲۸ / جنوری ۲۰۰۵ء)

راقم الحروف نے شبلی کے حواشی کو شمار کیا ، یہ تعداد میں ۴۲ ہیں (لطف کے دیباچہ کے حواشی اس تعداد میں محسوب نہیں) جن کی نوعیت یہ ہے:

الفاظ کے مطالب اور مفہوم اشعار کے سلسلے میں	۱۳
مبہم عبارت کی وضاحت کے سلسلے میں	۵
الفاظ کی صحت کے سلسلے میں	۲
اضافی معلومات کے سلسلے میں	۴
تصحیح معلومات کے سلسلے میں	۱
تنقیدی حواشی	۵
قرأت درست کرنے کے سلسلے میں	۴

تصحیح اور قیاسی تصحیح کے سلسلے میں	۴
اضافہ کلام کے سلسلے میں	۱
انتساب اشعار کے سلسلے میں	۲
املا کے بارے میں	۱
	کل تعداد ۴۲

حواشی کی مذکورہ فہرست سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تصحیح متن کے لئے شبلی کے پیش نظر کوئی خاص اصول نہیں تھا، یہ حواشی تشریحی یا اشاراتی ہیں، تصحیح متن سے ان کا بالواسطہ تعلق نہیں، بیشتر حواشی نامانوس لفظوں کے مطالب، جملوں کے صحیح تلفظ یا ساخت سے متعلق ہیں، یہ حواشی چھوٹے چھوٹے ایک ایک فقرے یا سطر و نصف سطر پر مشتمل ہیں، ایک سطر سے زائد کے حواشی صرف نو ہیں، ان میں طویل ترین حاشیہ ۴ سطری ہے جو مولانا حالی پر نقد کی نوعیت رکھتا ہے۔ (ص ۳۸، طبع دوم)

مجموعی طور پر حواشی کارآمد ہیں لیکن کتاب کی نوعیت ترتیب کے لحاظ سے یہ متن کے حسب حال نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شبلی نے اس کام کو دل جمعی کے ساتھ نہیں کیا اور نہ اسے اپنی تالیفات میں جگہ دی، "مکاتیب شبلی" کی دونوں جلدیں اور "حیات شبلی" اس کے ذکر سے خالی ہیں، ظاہر ہے اس طرح کا کام شبلی جیسی عبقری شخصیت کے لئے وجہ افتخار نہ اس دور میں ہوسکتا تھا اور نہ آج بن سکتا ہے، تاریخی طور پر اس کی اہمیت سے بہرحال انکار نہیں کیا جاسکتا۔

تصحیح متن کے لئے گلشن ہند کے خطی نسخے کا دوسرے دست یاب نسخوں سے تقابل ضروری تھا جو ممکن نہیں ہوسکا (۷)، متن میں جہاں تہاں جو خلا تھے وہ بڑی حد تک شبلی نے پُر کرنے کی کوشش کی لیکن بعض مقامات ان کی نظروں سے اوجھل رہے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ شبلی کی معلومات ان مقامات کا احاطہ نہیں کرسکتی تھی، البتہ ان مقامات کی موجودگی ہی سے یہ خیال مستحکم ہو جاتا ہے کہ تصحیح و تحشیہ کا کام فرمائش پر عجلت میں کیا گیا ہے، ایسے چند مقامات حسب ذیل ہیں:

صفحہ ۷ پر لطف کی اس عبارت "کرم نام سی کی ندی سے کہ صوبہ عظیم آباد کی سرحد میں ہے" کے پہلے ٹکڑے کی حاشیہ میں وضاحت کی ہے۔ "یعنی اس ندی سے جس کا نام کرم تھا"، یہ اطلاع صحیح درست نہیں، یہ معروف ندی ہے اور اس کا نام "کرم ناسا" ہے، غالباً ناسا کو شبلی نے "نام سی" پڑھا اور حاشیہ دے کر اس کے ابہام کو دور کیا، بہتر یہ تھا کہ ندی کے نام کی تصدیق کر لی جاتی۔

صفحہ ۳۳ پر تذکرہ نگار نے شیخ ولی اللہ اشتیاق دہلوی کا ترجمہ دیا ہے لیکن کوائف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتخلص بہ امین دہلوی) کے درج کر دیے ہیں، تذکرہ نگار ان دو جدا جدا شخصیات سے واقف نہیں، اس نے شاہ صاحب اور ان کے فرزند شاہ عبدالعزیز کی پس پردہ ہجو بھی کی ہے، مناقب معاویہ اور ابطال حسین میں ان کی دو کتابوں کا نام بھی لکھا ہے، شبلی نے اس ترجمہ پر دو حواشی دے کر اول تذکرہ نگار کی نیت کا خلاصہ کیا ہے اور کتب کے نام کی صحت کرتے ہوئے "مناقب معاویہ" کو فرضی قرار دیا ہے لیکن وہ یہ تصحیح کرنے سے قاصر رہے کہ شیخ ولی اللہ اشتیاق اور شاہ ولی اللہ دو علاحدہ علاحدہ شخصیات ہیں۔

صفحہ ۴۱ پر امین عظیم آبادی کا شعر ہے:

بتاں کے واسطے گھر بار کو اپنے بہا نکلا　　یہ طفل اشک میرا، عاشقی میں بے بہا نکلا

مصرعہ ثانی میں "بے بہا" کی جگہ "بہ بہا" ہونا چاہیے تھا، اسی صفحہ پر ایک اور شعر ہے:

خط نے مارا ہے حسن پر شب خوں　　کیا ہی جھگڑا ہے سوائیکا

مصرعہ ثانی خارج از وزن ہے، "جھگڑا" کے بعد یہ کتابت سے رہ گیا ہے، "سوائے" کا محل نہیں، کیوں کہ غزل کے قوافی آنے بہانے وغیرہ ہیں، یہ لفظ "سوانے" ہونا چاہیے تھا، بہ معنی سرحد (کیا ہی جھگڑا یہ ہے سوانے کا)۔

صفحہ ۴۳ پر اسی شاعر کا شعر ہے:

سیل آتی ہے تو آنے دو مرا کیا لے گی　　گھر میں اک میں ہوں پڑا اور کئی بہتے ہیں

غزل کے اشعار میں جیتے، سیتے، پیتے کے قافیے ہیں، بہتے کا محل نہیں، صحیح لفظ میتے ہونا چاہیے جو سیل کی رعایت سے لایا گیا ہے، میر نے "شکارنامے" کے ایک بند میں اس لفظ کا استعمال اس طرح کیا ہے:

نہیں خوں بستگی سے چشم تر بند　　جراحت نے کیے ہیں میتے سر بند

غرض کہ شبلی کی یہ کاوش تاریخی طور پر اردو میں تصحیح متن کی اولیت روایت کا درجہ ضرور رکھتی ہے، لیکن معیار و منہاج کے لحاظ سے یہ شبلی کے علمی مرتبے اور تصنیفی و تالیفی دروبست کی صلاحیت سے فروتر ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ سطور بالا میں ادبی تحقیق کی روایت میں شبلی کی جن اولیات پر گفتگو کی گئی ہے وہ بالترتیب یہ ہیں:

۱-ماخذ و مواد کی تلاش و تفتیش۔ ۲-حوالوں کا فٹ نوٹ میں اندراج۔ ۳-راوی اور روایت۔ ۴-تحقیق منسوبات۔ ۵-تدوین متن۔

لیکن شبلی کے تحقیقی عمل کو صرف ان پانچ شقوں تک محدود نہ سمجھا جائے، یہ تو ان کی اولیت کی نشانیاں ہیں، ان کے اختیار اور وضع کردہ ''نظام تحقیق'' میں مشروق و مغرب کے بہت سے رہنما اصول تحقیق آگئے ہیں، ضرورت ہے کہ ان کی تصانیف و مقالات سے انہیں اخذ کر کے مرتب کیا جائے اور تحقیق میں ان کی حیثیت اور قدر و قیمت کا تعین کیا جائے۔

جہاں تک موجودہ دور میں شبلی کی معنویت کا سوال ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ انہوں نے تحقیق کے بعض ابتدائی اور اہم اصولوں کو تسلسل و تواتر کے ساتھ اپنایا اور تحقیق کے طریق کار کی روایت کو تقویت دی، جس کا فیض بعد کی تحقیق اور محققین کو پہنچا، پروفیسر سید امیر حسن عابدی نے اپنے مضمون ''تنقید شعر العجم'' میں لکھا ہے:

اگر علامہ شبلی کے کارنامے عالم وجود میں نہ آتے تو حافظ محمود شیرانی جیسی عظیم شخصیتیں بھی عالم وجود میں نہ آتیں، چراغ سے چراغ جلتا ہے، علامہ نے جلایا تھا اس کی روشنی میں دوسرے چراغ جلے ہیں۔ (حافظ محمود شیرانی، تحقیقی مطالعے، ص ۲۵۲)

دوسری صورت یہ ہے کہ سوانحات سے متعلق سلسلہ وار انہوں نے جو تحقیقی کام کیا (المامون ۱۸۸۷ء، سیرۃ النعمان ۱۸۹۲ء، الفاروق ۱۸۹۸ء، الغزالی ۱۹۰۲ء، سوانح مولانا روم ۱۹۰۶ء اور سیرۃ النبی ۱۹۱۸ء)، اس نے بالآخر اردو میں ایک مستقل موضوع کی صورت اختیار کر لی، آج جامعات میں علمی و ادبی شخصیات پر پی ایچ ڈی کے لئے لکھے جانے والے علمی مقالات (تھیسس) کی تعداد بہت زیادہ ہے، جو احوال و آثار، حیات و خدمات، سوانح و شخصیت، حیات و فن، اسی طرح کے دوسرے عنوانات کے تحت کثرت سے لکھے جارہے ہیں، مختلف علاقوں، مختلف ادوار اور مختلف اصناف ادب کے ادیبوں کی سوانحات اور علمی و ادبی کارگزاریوں پر لگاتار داد تحقیق دی جارہی ہے، یہ سب شبلی ہی کا فیضان ہے، اس فیضان میں شریک غالب کی حیثیت سے حالی کی خدمات کو بھی

نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، حیات سعدی ۱۸۸۲ء، یادگار غالب ۱۸۹۷ء، حیات جاوید ۱۹۰۱ء، زندۂ و جاوید رہنے والی سوانحات ہیں لیکن بہ قول مالک رام:

حالی کا کام محدود سطح پر تھا، انہوں نے سیرت سے باہر قدم نہیں رکھا، ان کی مثال زیادہ سے زیادہ اسی میدان میں لوگوں کو رہنمائی کر سکتی ہے، اس سے عام تحقیقی ذوق اور تجسس کی خواہش نہیں پیدا ہوسکتی تھی، یہ کام ان کے ہم عصر مولانا شبلی نعمانی نے کیا...... شبلی کے تحقیقی کام کی بہترین مثال ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں ہیں، ان سب کتابوں میں واقعات کی تحقیق، ان کی ترتیب اور دور و بست، اخذ نتائج وغیرہ ہر ایک بات قابل تعریف ہے، اب ان موضوع سے متعلق کچھ اور لکھنا محال ہے۔ (اردو میں تحقیق، ص ۱۰،۱۱)

عصر حاضر میں شبلی کی معنویت کا یہ ایک ایسا زندہ، قومی اور توانا ثبوت ہے، جس سے ان کے مخالفین بھی انکار کرنے کی جرأت نہ کرسکیں گے، شیخ محمد اکرام کے ایک اقتباس پر اس مضمون کا خاتمہ کرتا ہوں، وہ لکھتے ہیں:

''شبلی کے متعلق اختلاف آرا شدت سے ہے، ان کے مخالفین کو تو ان کے کمال فن میں بھی عیب نظر آتے ہیں اور جو لوگ ان کے معتقد ہیں وہ انہیں سرسید سے جا ملاتے ہیں...... تاہم یہ سچ ہے کہ سرسید کے حلقے میں پیر میکدہ کے بعد شبلی جیسی جامع الصفات ہستی کوئی نہ تھی...... بہ حیثیت مجموعی وہ شاید سرسید کے بعد سب سے آگے آگے جاتے ہیں، آخر حالی، آزاد، محسن اور وقار الملک کتنے آسمانوں کے تارے تھے، ایک یا دو یا تین کے، ان میں شبلی کی بوقلمونی کہاں سے آئے گی...... قلیل مدت حیات اور کم زور صحت کے باوجود شبلی نے جو کر دکھایا، کیا وہ ایک معجزے سے کم ہے''۔ (موج کوثر، جلد ۳، ص ۲۳۴)

حواشی

(۱) مالک رام (ف ۱۹۹۳ء)، پہلے محقق ہیں جنہوں نے شبلی کی تحقیقی خدمات کا اعتراف کیا، ۱۹۹۶ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلاس میں علی گڑھ میں انہوں نے خطبہ صدارت دیا تھا جس کا عنوان تھا

''اردو میں تحقیق'' (دہلی ۱۹۶۶ء) یہ اعتراف اسی خطبہ صدارت میں تھا جو ڈھائی صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲) شبلی کی تحقیقات کا موضوع عموماً مذہبی شخصیات، مذہبی موضوعات یا تاریخ رہے ہیں، حدیث، قرآن، تاریخ، کلام، فلسفہ، عربی زبان و ادب پر فاضلانہ دست رس کے بغیر شبلی کے کام کا تحقیقی جائزہ ممکن نہیں، اردو محققین کی صف میں جو نام ابھر کر سامنے آتے رہے ہیں ان میں کوئی بھی محقق ایسا نظر نہیں آتا جو ان علوم پر فاضلانہ نگاہ رکھتا ہو، سوائے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے، شاید شبلی کے ساتھ بے اعتنائی کی ایک وجہ یہ بھی ہو، موجودہ دور کے محققین میں ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی مذکورہ اوصاف سے متصف نظر آتے ہیں، انہوں نے شبلی کے مطالعے پر عمر عزیز کا بہت بڑا حصہ صرف کیا ہے لیکن شبلی سے متعلق تحقیقات میں ان کی ابھی صرف ایک کتاب ''مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار'' اور بعض مضامین ہی منظر عام پر آسکے ہیں۔

(۳) سفرنامہ روم و مصر و شام میں انہوں نے پروفیسر آرنلڈ کو (جو مدرسۃ العلوم میں فلسفہ کے پروفیسر تھے) اپنا استاد بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ''میں نے ان سے فرنچ زبان سیکھی ہے'' (ص ۸)، سرسید احمد خاں کو ایک خط میں قسطنطنیہ سے اطلاع دیتے ہیں:

''میں نے ترکی پڑھنی شروع کی ہے اور انشاء اللہ کچھ نہ کچھ بہ قدر ضرورت واپسی کے وقت تک سیکھ لوں گا''۔ (مکاتیب شبلی جلد اول، ص ۱)

(۴) پاکستانی محقق ڈاکٹر نجم الاسلام (ف ۲۰۰۱ء) نے سندھ یونی ورسٹی کے علمی مجلے ''تحقیق'' (ناشر شعبہ اردو سندھ یونی ورسٹی، ۹۷-۱۹۹۶ء) میں ''گوشہ تحقیق منسوبات'' مرتب کیا تھا، جس میں منسوبات اور مجہول و مجعول کتب پر قدیم و جدید محققین کے ۶۵ مقالات شامل ہیں جو ۴۴۸ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، اس گوشہ کی ابتدا شبلی کے مضمون سے کرتے ہیں، انہوں نے اپنے تعارف میں لکھا ہے:

اردو میں تحقیق منسوبات کی پہلی کوشش شبلی کی تحریر ہے جو ان کی تصنیف الغزالی میں ''امام غزالی کی بحوث فیہ تصنیفات'' کے عنوان سے آتی ہے ...... یہ نقش اول ہے، ایک وسیع میدان کی طرف پہلا قدم ...... اس میدان میں تقدم کی فضیلت شبلی کے حصے میں آئی۔ شبلی کی فضیلت تقدم ہمیں تسلیم ہے۔ (ص ۴۹۲)

(۵) انجمن ترقی اردو کا قیام ۳؍ جنوری ۱۹۰۳ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں عمل میں آیا، قیام کے بعد اس کے اولین سکریٹری مولانا شبلی قرار پائے (انجمن ترقی اردو ہند کی علمی اور ادبی خدمات، ص ۳۰-۲۹)، دسمبر ۱۹۰۵ء میں شبلی نے انجمن کی سکریٹری شپ سے استعفا دے دیا (حوالہ سابق، ص ۵۱)، شبلی کے زمانے میں انجمن کی تشکیل و تنظیم پر زیادہ توجہ صرف ہوئی لیکن پھر بھی ۱۴ کتابیں زیر قلم تھیں جو انگریزی کتب کے ترجموں اور سوانحات پر مشتمل تھیں، شبلی کے عہد میں صرف ۲ کتابیں شائع ہوئیں)

(۶) رفاقت علی شاہد نے شبلی کے مرتبہ گلشن ہند کو اردو تحقیق کا نقطہ آغاز مانا ہے لیکن وہ اپنے بیان میں گلشن ہند پر شبلی کے مقدمے کی اطلاع بھی دیتے ہیں جو غلط ہے، ان کا بیان حسب ذیل ہے:

اردو کی ادبی تحقیق کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں، محض ایک صدی تو گزری ہے، جب اردو میں ادبی تاریخی تحقیق کا رواج ہوا، اگر شبلی نعمانی کے مقدمہ تذکرہ گلشن ہند (از مرزا علی لطف، مطبوعہ لاہور، ۱۹۰۶ء) کو اس کا نقطہ آغاز مانا جائے تو تب سے آج تک اردو ادب کی تحقیق پر ہزاروں تحریریں...... وجود میں آچکی ہیں۔ (مقدمہ تحقیق شناسی، ص ۱۵)

(۷) ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

تحقیق و مراجعت کا عام دستور یہ ہے کہ اصل سے مقابلہ و موازنہ کیا جائے، تاکہ نقل میں اگر کوئی تسامح ہو گیا ہو تو اس کی اصلاح یا وضاحت کر دی جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب دوسرے نسخ موجود ہوں لیکن چوں کہ گلشن ہند کا کوئی نسخہ سرے سے دست یاب ہی نہیں تھا اور نہ آج تک دست یاب ہو سکا ہے، اس لئے اس سے مقابلے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (ہماری زبان، ۲۲، ۲۸؍ جنوری ۲۰۰۵ء)

یہ بیان درست نہیں ممکن ہے شبلی کے عہد میں اس تذکرے کا کوئی نسخہ دست یاب نہ ہو لیکن فی الوقت اس کے بارہ نسخے دریافت ہو چکے ہیں (لطف حیات اور کارنامے، ص ۱۳۰)، اس کے چار نسخے انجمن ترقی اردو کراچی کی ملکیت ہیں، ان کا تعارف کراتے ہوئے افسر صدیقی مرحوم نے واقعات کے سلسلے میں لطف کی بعض لغزشوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ (ملاحظہ کریں مخطوطات، انجمن ترقی اردو، جلد اول، ص ۱۲۳ تا ۱۳۱)

کتابیات

۱- ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ رشید حسن خاں اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۹۰ء
۲- اردو میں تحقیق، مالک رام جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۶۶ء

۳- الغزالی علامہ شبلی نعمانی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ ۱۹۹۷ء

۴- الفاروق علامہ شبلی نعمانی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ ۱۹۹۳ء

۵- المامون علامہ شبلی نعمانی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ ۲۰۰۳ء

۶- تحقیق شناسی (مجموعہ مقالات) مرتب رفاقت علی شاہد ندیم یونس پرنٹرز لاہور ۲۰۰۳ء

۷- تذکرہ ماہ وسال مالک رام مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۹۱ء

۸- تلاش غالب پروفیسر نثار احمد فاروقی غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی ۱۹۹۹ء

۹- جائزہ مخطوطات اردو ج/۱ مشفق خواجہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۹ء

۱۰- حافظ محمود شیرانی، تحقیقی مطالعے پروفیسر نذیر احمد غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی ۱۹۹۱ء

۱۱- خطوط شبلی محمد امین زبیری تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور ۱۹۳۵ء

۱۲- دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات ج/۱ پروفیسر خورشید نعمانی ردولوی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ ۲۰۰۳ء

۱۳- سفرنامہ روم ومصر وشام علامہ شبلی نعمانی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ ۱۹۹۹ء

۱۴- سیرۃ النبی ج/۱ علامہ شبلی نعمانی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ ۲۰۰۳ء

۱۵- شبلی بحیثیت سیرت نگار ظفر احمد صدیقی عبارت آفسیٹ دہلی ۲۰۰۴ء

۱۶- شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں سید شہاب الدین دسنوی انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۸۷ء

۱۷- کسوف الشمسین نظامی بدایونی نظامی پریس بدایوں ۱۹۱۵ء

۱۸- گلشن ہند (مرزا علی لطف) مرتبہ محی الدین قادری زور انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۳۴ء دوم

۱۹- مکاتیب شبلی ج/۱ سید سلیمان ندوی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ ۱۹۶۶ء

۲۰- موج کوثر ج/۳ شیخ محمد اکرام ادبی دنیا دہلی ۲۰۰۱ء

۲۱- تذکروں کا تذکرہ نمبر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نگار کراچی مئی جون ۱۹۶۴ء

۲۲- شبلی نمبر شہریار فکرونظر علی گڑھ جون ۱۹۶۴ء

۲۳- گوشہ تحقیق منسوبات ڈاکٹر نجم الاسلام تحقیق جام شورو ۹۷-۱۹۹۶ء

☆☆☆☆☆☆

اسلامی عہد کے سسلی کی علمی وادبی تاریخ [1]

از:- جناب محمد زکریا ورک☆

سسلی بحیرہ روم کا سب سے بڑا جزیرہ ہے، اس کے علاوہ قابل ذکر جزائر قبرص، سارڈینیا، کورسیکا، مالٹا اور کریٹ ہیں، سسلی مثلث کی صورت میں دکھائی دیتا ہے، مشرق سے مغرب تک اس کی لمبائی صرف ۱۷۵ میل ہے، تیونس سے یہ بحری راستے سے صرف نوے میل اور اٹلی سے یہ صرف دو میل کے فاصلہ پر ہے، اس کے دارالخلافہ کا نام پالیرمو ہے جس کی آبادی ایک ملین کے قریب ہے، جب کہ پورے جزیرہ کی آبادی چار ملین سے زیادہ ہے، سسلی کے لوگ یونانی، فرنچ، سپینش، اطالین اور عرب نسل کے ہیں، مشہور زمانہ یونانی سائنس داں ارشمیدس یہاں کے شہر سیرا کیوس کا رہنے والا تھا، یہاں کا مشہور آتش فشاں پہاڑ جبل النار (Mt. Etna) ہے جو اکثر لاوا اگلتا رہتا ہے۔

چھوٹا ہونے کے باوجود تاریخی طور پر اس جزیرے کی اہمیت مسلم ہے، اس کے محل وقوع کے پیش نظر یہ مشرق اور مغرب، اسلامی اور یورپین تہذیبوں کے درمیان اتصال کی ایک کڑی رہ چکا ہے اور یورپ اور افریقہ کے درمیان بھی یہ کڑی (لنک) کے طور پر اہمیت رکھتا ہے، پالیرمو شہر

(۱) معارف: اندلس اور صقلیہ (سسلی) کی تاریخوں پر مولانا سید ریاست علی ندوی کی کتابیں دارالمصنفین سے عرصہ ہوا چھپی تھیں اور وہ دارالمصنفین کی بڑی اہم تصانیف خیال کی جاتی ہیں لیکن وہ آج سے تقریباً ۷۰-۷۵ برس پہلے لکھی گئی تھیں اور اس میں شبہ نہیں کہ بڑی محنت اور تحقیق سے ایسے وقت لکھی گئی تھیں جب خصوصیت سے صقلیہ پر کوئی قابل ذکر کتاب نہیں تھی مگر اب روز بہ روز نئی معلومات سامنے آتی جارہی ہیں، اس لحاظ سے یہ مضمون اہم ہے۔

☆ 381 Waterloo drive, kingston, canada Nov 2005

کے اندرونی حصہ میں ایک چرچ سان پاؤلینو (San Paulino) ابھی بھی موجود ہے جو کسی زمانے میں مسجد تھی، شہر میں ایک کیتھڈرل بھی ہے جس کے اندر داخل ہونے والے گیٹ کے ستونوں پر قرآنی آیات لکھی ہوئی نظر آتی ہیں، یہاں جامع مسجد ہوا کرتی تھی، جہاں مسلمان پانچ وقت اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان دیا کرتے تھے، شہر میں اس وقت جہاں جہاں گرجا گھر ہیں وہاں وہاں مساجد تھیں، کچھ سال قبل آرچ ڈیوسیس آف پالرمو (Archdiocese of Palermo) نے شہر میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر ایک چرچ ان کو واپس دے دیا تھا، تاکہ وہ اسے مسجد کے طور پر استعمال کرسکیں، شہر کے اندر ایک قلعہ جو بارہویں صدی میں تعمیر ہوا تھا اس کا نام Alazisa (العزیز) ہے، یہاں ایک میوزیم بھی ہے جس میں اسلامی نوادر اور کتابیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

سب سے پہلے شام کے گورنر حضرت معاویہؓ کے دور حکومت میں مسلمان مجاہدین نے یہاں ۶۵۲ء میں بحری حملہ کیا تھا، موسیٰ بن نصیر کے دور میں بھی مسلمانوں نے یہاں حملہ کیا، خلیفہ ہارون الرشید کا سفیر فرانس کے بادشاہ شارلیمان سے جب ملنے کے لئے جارہا تھا تو وہ یہاں ۸۰۱ء میں آیا تھا۔

مسلمانوں نے سسلی پر ۲۶۴ سال یعنی ۸۲۷ - ۱۰۹۱ء تک حکومت کی، اس کے بعد نارمن (۱۰۹۳ء-۱۱۸۹ء) یہاں حکومت کرنے لگے مگر ان کے عہد میں بھی اگلے ایک سو سال تک اسلامی علوم و فنون، ثقافت نے بہت ترقی کی، ۸۲۷ء میں جو فل سکیل اسلامی حملہ سسلی پر ہوا، وہ تیونس کی بندرگاہ سوس (Sousse) سے شروع ہوا جس میں ایک سو جہاز اور کشتیاں شامل تھیں، اس میں دس ہزار فوجی تھے، اسلامی فوج کا کمانڈر اسد الفرات ابن سنان تھا جو قرآن پاک کا زبردست مفسر تو تھا مگر فوجی معاملات میں اسے کوئی خاص تجربہ حاصل نہ تھا، فوج میں عرب فوجیوں کے علاوہ بربر فوجی، ایرانی فوجی اور اندلسی فوجی بھی شامل تھے، اسلامی فوج مزارا (Mazara del Vallo) کے مقام پر اتری، دونوں فوجوں میں جھڑپیں ہوئیں مگر اس جزیرہ کو مکمل طور پر زیر کرنے میں مسلمانوں کو ۷۵ سال لگ گئے، اسلامی سپین کی فتح میں یہودیوں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا، یوں صرف تین سال میں پورا سپین زیر نگیں ہوگیا مگر سسلی میں ایسا نہ ہوا کیوں کہ یہاں مقابلہ

بازنطینی سلطنت سے تھا، اس لئے ہر لڑائی بڑی خوں ریز ہوتی تھی، پالیرمو (Palermo) کا نام المدینہ میں تبدیل کردیا گیا، اس شہر کو مسلمانوں نے ۸۳۱ء میں تسخیر کر کے اسے دارالخلافہ قرار دے دیا، اپنی فتح کا جشن منانے کے لئے مسلمانوں نے شہر میں تین سو مساجد تعمیر کردیں، جلد ہی حمام، ہسپتال، بازار، محل، قلعے بھی تعمیر کردیے گئے، جزیرے کی آبادی دوگنا ہوگئی، عربوں نے نظام آب پاشی اور کھانے کا طریقہ بدل کے رکھ دیا کیوں کہ ان کی سائنسی مہارت اور انجینئرنگ کمال کی تھی، سیراکیوس (Syracuse) پر قبضہ انہوں نے ۸۷۰ء میں حاصل کیا، مالٹا کا جزیرہ ایک مہینہ کے محاصرہ کے بعد ۸۷۰ء میں ان کے زیر تسلط آگیا، ۸۴۶ء میں مجاہدین نے کیتھولک عیسائیت کے مرکز روم پر حملہ کر کے سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے چرچوں پر اسلامی جھنڈا لہرادیا اور پوپ لیو ششم (Pope leo VI) نے مسلمانوں کو پچیس ہزار چاندی کے سکوں کا سالانہ تاوان دینے کا وعدہ کیا جس پر مسلمان وہاں سے واپس چلے گئے۔

جزیرہ پر ناراتھ افریقہ کے تین مسلمان خاندان سلاطین اغلبی (۹۰۳ء)، فاطمی (۹۰۹ء) اور کلبی (۹۴۸ء) کی حکومت رہی، اگرچہ جزیرہ کو عربوں نے فتح کیا تھا مگر یہاں بسنے والے افراد زیادہ تر بربر مسلمان تھے، حسین الکلبی (وفات ۹۶۵ء) کو فاطمی خلیفہ المنصور نے یہاں کا گورنر مقرر کیا تھا، کلبی خاندان کی حکومت کے ۱۰۵۲ء میں خاتمہ کے بعد ملک سیاسی بحران کا شکار ہوگیا، یہاں کے گورنر یوسف بن عبداللہ (۹۹۸-۹۸۹ء) کے دور حکومت میں سسلی نے بہت ثقافتی اور علمی ترقی کی، مسلمانوں نے یہاں کی تہذیب، ثقافت اور آرٹس میں قابل قدر اضافے کئے، یہ مضمون اس عروج کی مختصر مگر دل کو گرمادینے والی شیریں داستان ہے۔

ابن حوقل جو بغداد کا مشہور جغرافیہ داں تھا، وہ سسلی آیا اور اس نے پالیرمو کو اپنے سفرنامے میں تین سو مسجدوں والا شہر قرار دیا تھا، اس نے شہر کے اردگرد باغات ہی باغات دیکھے تھے، قرطبہ کے بعد یہاں پر سب سے زیادہ مساجد تھیں، بغداد اور قرطبہ کے بعد عالم اسلام میں پالیرمو تیسرا اہم بین الاقوامی شہر تھا، پالیرمو کی آبادی اس وقت ایک لاکھ کے قریب تھی، زراعت کے لئے مسلمان اپنے ساتھ ہائیڈرالک ٹیکنیکس لے کرآئے، کھیتی باڑی کے لئے مسلمانوں نے نہریں اور دریا بنائے اور ان کی دیکھ بھال کی، پانی کا یہ نظام ابھی بھی پالیرمو میں زیر استعمال ہے،

اس نظام زراعت سے پورا جزیرہ جنت نظیر بن گیا اور ہر طرف نئے نئے پھل جیسے مالٹے، لیموں، گنے، کپاس، شہتوت، کھجوریں، بینگن، زیتون، تربوز نظر آنے لگے جو لوگوں نے پہلے یہاں کبھی دیکھے ہی نہ تھے، مسلمانوں نے ہی یہاں چاول اگائے، گندم کی نئی قسمیں لگائیں گئیں، یہاں سے معدنی نمک، لیموں اور مالٹے اعلا کوالٹی کے سپین بھیجے جاتے تھے، گنے کو اگانے کے جو طریقے یہاں استعمال میں لائے گئے وہی بعد میں یورپ میں استعمال کئے گئے، ایمونیم اور ریشم یہاں سے اکثر برآمد کیا جاتا تھا، ریشم پر بیل بوٹے نکالنے اور نقش و نگار کرنے کی فیکٹریاں تھیں، ایسا ریشم اسلامی سپین اور یورپ کو فروخت کیا جاتا تھا، پالیرمو کی آبادی ۱۰۵۰ء میں دو لاکھ ہوگئی تھی۔

ہر شہر کے ڈاؤن ٹاؤن (مدینہ) میں سینٹرل مارکیٹ (سوق) ہوتی تھیں جہاں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی، مارکیٹ میں ٹیکسٹائل، زیورات، گرم مصالحہ جات، درآمد شدہ مال اور منی چینجر کی دکانیں ہوتی تھیں، غیر ملکی تجارت کرنے والے تاجروں کے لیڈر کو رئیس التجار کہتے تھے۔

مسلمانوں نے یہاں آکر تین طرح کی انڈسٹریز کو بہت ترقی دی، کاغذ بنانے کی انڈسٹری، بحری جہاز اور نقش و نگار والے ٹائلز (Mosaic tiles) بنانے کی انڈسٹری اسلامی سپین، مصر اور بحیرہ روم کے اردگرد کے اسلامی ممالک میں تجارت زوروں پر تھی، سسلی کے اہم محل وقوع کے پیش نظر اکثر بڑی طاقتیں یہاں حملے کرتیں، اس لئے مختلف شہروں کے دفاع کے لئے ۲۳ قلعے تعمیر کئے گئے تھے، پالیرمو کے اردگرد اونچی فصیل اور خندق بنائی گئی تھی، ہر اقلیم (ڈسٹرکٹ) میں جامع مسجد ہوتی تھی، نارتھ افریقہ، مصر، اندلس کے مسلمان علما اور فقہا یہاں اکثر تبادلہ خیال یا عارضی رہائش کے لئے آتے تھے، اندلس میں جب اسلامی حکومت اپنے عروج پر تھی تو اس کا اثر سسلی پر بہت گہرا تھا، کئی نامور سسلین شاعر اندلس میں جا کر آباد ہوگئے، جیسے ابن حمدیس (۱۰۵۵-۱۱۳۲ء) سسلی کا سب سے مشہور شاعر تھا، جس کی پیدائش سیراکیوس میں ہوئی تھی، وہ ہجرت کر کے اشبیلیہ میں آباد ہوگیا تھا، اس کا دیوان روم سے ۱۸۹۷ء میں شیاپ ارلی (Schiaparelli) نے شائع کیا تھا، مساجد علمی تبادلہ خیال کا مرکز ہوتی تھیں جہاں فقہ، حدیث، قرأت، گرامر کی تعلیم دی جاتی تھی، جو مدرس یہاں ملازم ہوتے ان کے لئے جنگ پر جانا ضروری نہیں ہوتا تھا، شعرا کی ایک فہرست جو ۱۱۵۰ء میں تیار کی گئی تھی، اس میں ایک سو عرب شاعروں کے نام گنوائے گئے تھے،

سسلی میں سائنس، میڈیسن، فقہ پر چند بنیادی کتابیں سپرد قلم کی گئیں، مسلمانوں کے زیر حکومت یہاں تعلیم کی شرح ۱۰۸۷ء میں بہت زیادہ تھی بہ مقابلہ ۱۸۷۰ء کے جب یہاں اطالین حکمراں تھے (یعنی ستر فی صد)، بیسویں صدی کے شروع تک اسلامی اثر یہاں نمایاں نظر آتا تھا حالاں کہ ۱۲۸۰ء کے بعد مسلمان خال خال ہی نظر آتے تھے۔

سسلی کی علمی و ادبی دنیا: سسلی میں مسلمانوں کی آمد کے بعد.............ہی سے لوگ عربی زبان بولنے لگے اور آج بھی مقامی زبان میں عربی زبان کے الفاظ شامل ہیں، ابن یونس (۱۰۵۱ء) سسلی کا مشہور فقیہ تھا جس نے المدونہ کی تفسیر لکھی تھی، عتیق علی السمانتاری نامور ماہر دین تھا جس نے اسلامی ممالک کے لمبے لمبے سفر کئے تھے، مزاری بھی ماہر علم دین تھا جس نے الجوینی کی کتاب پر تقریظ لکھی تھی، سعید بن سلام نے حجاز کا سفر کیا پھر وہ ایران گیا اور نیشاپور میں ۹۸۳ء میں راہی ملک عدم ہوا، عتیق بن محمد سسلی کا نامور صوفی تھا جس کی وفات بغداد میں ہوئی، محمد بن خراسان بھی قرآن حکیم کا ممتاز اسکالر تھا، جس نے مصر میں تحصیل علم کی تھی، اسماعیل بن خلاف (وفات ۱۰۶۳ء) سسلی سے ہجرت کر کے اندلس چلا گیا جہاں اس نے مشہور کتاب "عنوان فی القرأت" سپرد قلم کی جس کے قلمی مسودات برلن کی لائبریری، آیا صوفیہ استنبول اور بانکی پور (ہندوستان) میں ابھی تک محفوظ ہیں، ابراہیم التمیمی حدیث کا اسکالر تھا جس نے عراق میں سکونت اختیار کرلی تھی، اسد بن فرات (پیدائش ۷۵۹ء) فقہ کا نامور اسکالر تھا جو مدینہ منورہ میں حضرت امام مالکؒ سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہاں آباد ہوگیا تھا، اس کی مشہور کتاب کا نام "اسدیہ" ہے۔

عبداللہ سسلی کا ممتاز ماہر نباتات تھا جس نے ڈیاسکورائیڈس (Dioscorides) کے نباتات پر رسالہ کا ترجمہ اندلس کے خلیفہ عبدالرحمان الثالث کے لئے کیا تھا، ابو عبداللہ القرانی سسلی کا شاعر، ماہر فلکیات اور ریاضی داں تھا، ابوسعید ابراہیم سسلی کا مشہور طبیب تھا، جس نے فارماکالوجی پر کتاب لکھی جو ابھی تک محفوظ ہے، ابوبکر الصقلی بھی یہاں مشہور عالم مدرس تھا، احمد عبدالسلام نے شیخ الرئیس بوعلی سینا کی طب کی کتابوں پر کمنٹری لکھی تھی۔

لسانیات کے میدان میں سسلی کے بہت سے علما غیر ممالک میں چلے گئے اور بعض

دوسرے اسلامی ممالک سے یہاں آکر آباد ہوگئے، مثلاً قرطبہ کا شاعر اور گرامر کا ماہر موسیٰ اصبغ سسلی ہجرت کر آیا اور الکتانی (۱۰۳۵-۱۱۱۸ء) سفر کرکے عراق گیا، وہاں سے ہندوستان آیا اور ایران میں راہی ملک عدم ہوا، سعید حسن عراق کا فرہنگ نویس تھا جس کی وفات سسلی میں ۹۹۵ء میں ہوئی، ابن رشیق (۱۰۰۰-۱۰۷۰ء) بھی لغت نویس تھا جس کی پیدائش شمالی افریقہ میں ہوئی مگر سسلی میں وفات پائی، نقد شعر میں اس کی کتاب کا عنوان "کتاب العمدہ" ہے جو قاہرہ سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی تھی۔

ابن البربہت بڑا ماہر لسانیات تھا جس نے الیگزنڈریہ میں تعلیم حاصل کی تھی، سسلی واپس آکر وہ پالیرمو میں جاگزیں ہوا اور ۱۰۶۸ء میں وفات پائی، شہرۂ آفاق لغت صحاح الجوہری وہی یہاں لے کر آیا تھا، ابن القطع نے منتخب اشعار کی ایک کتاب "درۃ الخاطرۃ" تالیف کی جس میں سسلی کے متعدد شعرا کا کلام دیا گیا تھا، ابن الخیاط پالیرمو میں گورنر کے دربار میں شاعر تھا، ابوزید الغمری (بربر) نے ایک کتاب سسلی کی تاریخ پر لکھی، یاد رہے کہ سسلی اندلس کی ریاست کا دسویں اور گیارہویں صدی میں ادبی صوبہ تھا، یہاں جو عربی بولی جاتی تھی وہ نارتھ افریقہ سے ملتی جلتی تھی۔

علی داؤد سمن تاری (۱۰۷۲ء) نے ایک نہایت عمدہ کتاب المدونہ الکبریٰ کے نام سے لکھی جس پر بن یونس اور ابن الحکم جیسے عالموں نے کام کیا، ابوالفراج الکتانی (۱۰۳۶-۱۱۱۸ء) صرف ونحو کا ماہر اور فرہنگ نویس تھا، محمد بن ابی الفراج (۱۱۲۲ء) مزارا کے شہر کا مکین تھا اور ممتاز قاریٔ قرآن اور ماہرِ صرف ونحو تھا، اس نے قرأت کے موضوع پر "کتاب الاستیلہ" لکھی، عثمان الحجاز (۱۱۴۹ء) بہت بڑا فقیہ تھا جو ہجرت کرکے اسکندریہ چلا گیا، اس نے مالکی فقہ پر متعدد کتابیں سپرد قلم کیں، محمد علی التمیمی (۱۱۴۲ء) مالکی فقہ اور علم دین کا اسکالر تھا، اس نے "کتاب المعلم" لکھنے کے علاوہ صحیح مسلم کی شرح لکھی، شمالی افریقہ کی الموحد تحریک (۱۱۴۶-۱۲۶۹ء) کا بانی ابن تومرت اس کا شاگرد عزیز تھا۔

ابومحمد عبدالجبار بن حمدیس (۱۰۵۵ ۱۱۳۳ء) اسلامی سسلی کا ذی شان اور عالی وقار شاعر تھا، اس نے سسلی کی تاریخ پر کتاب "تاریخ الجزیرہ الخضرہ" زیب قرطاس کی، وہ اندلس ۱۰۷۸ء میں گیا اور اشبیلیہ کے خلیفہ المعتمد کے درباریوں میں شامل ہوگیا، اس نے یوسف بن

تاشفین کی الفانسو ششم کے خلاف جنگ میں فتح پر ایک لمبا قصیدہ رقم کیا، وہ اپنی شاعری میں ایسے الفاظ استعمال کرتا تھا جس سے تصویر ابھر کر قاری کے سامنے آجاتی تھی، اس کے دیوان کو سکیاپاریلی (Schiaparelli) نے ایڈٹ کیا جو ۱۸۹۷ء میں روم سے شائع ہوا اور دوسری بار بیروت سے ۱۹۶۰ء میں "العرب فی الصقلیہ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

ابن بشرون الصقلی شمالی افریقہ سے سسلی آیا تھا، اس نے ایک دل چسپ کتاب "المختار فی النظم والنثر" کے نام سے تالیف کی جو غزلوں اور اشعار کا مجموعہ تھی، اس نے کیمسٹری پر کتاب "سرالکیمیا" لکھی، ابن الظفر الصقلی (۱۱۶۵ء) کا لقب حجۃ الدین اور برہان الاسلام تھا، اس کی اہم تصنیف کا نام "سلوان الموطا" ہے جس کا ترجمہ انگلش اطالین اور ترکش میں ہو چکا ہے، اس نے قرآن پاک کی تفسیر لکھی جس کا نام تفسیر کبیر تھا، اس نے گرامر، علم اللسان اور دیگر موضوعات پر ۳۲ کتابیں لکھیں جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: ینبوع الحیات، فوائد وحی، فی شرح اسماء الحسنی، خیر البشر، علم النبوۃ۔

ابوطاہر اسماعیل بن خلف الصقلی (۱۱۷۰ء) نے "العنوان فی القرآت" اور "کتاب الاکتفائی القرآت" لکھیں، وہ گرامر کا بھی ماہر اور قرآن حکیم کا زبردست قاری تھا، اس کی وفات شام میں ہوئی، ابوالقاسم علی بن جعفر جو ابن القطاع (۱۰۴۱-۱۱۲۱ء) کے نام سے بھی پہچانا جاتا تھا، پرتگال سے ہجرت کرکے مع اہل وعیال سپین آیا تھا، اس نے ابن البر سے گرامر اور لسانیات (فلالوجی) کی تعلیم حاصل کی، یہاں سے وہ مصر ہجرت کر گیا جہاں وہ صرف ونحو (گرامر) کی تعلیم دیا کرتا تھا، اس نے سسلی کی تاریخ پر تاریخ الصقلیہ لکھی جو صفحۂ ہستی سے ناپید ہو چکی ہے، اس نے سسلی کے ۱۷۰ شعرا کے کلام کا مجموعہ "الدرۃ الخطیرۃ من شعراء الجزیرۃ" کے نام سے قلم بند کیا، اس کی دوسری کتابوں کے نام "کتاب السیف" اور "کتاب العروض" ہیں۔

جیکب ابا ماری (Jacob Aba Mari) یہودی تھا جس نے ابن رشد کی شروح کو عبرانی میں ۱۲۳۲ء میں منتقل کیا نیز مشہور ہیئت داں الفرغانی کی فلکیات پر کتاب کا بھی ترجمہ کیا، یہودہ کوہن (Yahuda Cohen) اندلس سے ہجرت کرکے اٹلی ۱۲۴۷ء میں آیا، اس نے عربی میں ایک مبسوط انسائیکلوپیڈیا ترتیب دیا اور پھر اسی کو عبرانی میں بھی ڈھالا، چار اطالین ایسے بھی تھے

جنھوں نے عربی کتابوں کے تراجم کیے یعنی پلیٹو آف ٹوولی (Plato of Tivoli) نے البتانی اور الفرغانی کی علم فلکیات پر کتابوں کے تراجم کیے، سٹفین آف پیسا (Stephen of Pisa) نے علی ابن عباس المجوسی کی طب پر کتابوں کے تراجم کیے، باناکوسا (Banacosa) اطالین یہودی تھا، جس نے ابن رشد القرطبی کی طب پر کتاب الکلیات فی الطب کا ترجمہ ۱۲۵۵ء میں کیا، پاراویشس (Paravcious) نے وینس کے شہر میں ابن زہر اندلسی کی کتاب التیسیر کا ترجمہ ۱۲۹۰ء میں لاطینی میں کیا۔

فراج بن سالم سسلی کے شہر جرجنیٹی (Girgenti) کا رہنے والا تھا جس نے ۱۲۷۹ء میں محمد بن زکریا الرازی کے طب پر انسائیکلوپیڈیا کتاب الحاوی کا عبرانی میں ترجمہ کیا، یہ ترجمہ سسلی کے بادشاہ چارلس آف انجو (Charles of Anjou 1220-85) کی سرپرستی میں کیا گیا، اٹلی کے عالم فیراری ڈاگریڈو (Ferrari da Grado) جو اسلامی علوم سے گہری واقفیت رکھتے تھے، انہوں نے کتاب الحاوی کے بعض حصوں کی شرح لکھی، الرازی کی کتاب یورپ میں طب پر شائع ہونے والی پہلی کتاب تھی۔

اسلامی کلچر کا اثر: سسلی پر مسلمانوں کا قبضہ قریب تین سو سال تک رہا، اس طویل عرصہ میں وہ عرب، یورپ اور لاطینی تینوں کے کلچر سے متاثر رہا، جب نارمن یہاں قابض ہوئے تو بہت ساری مساجد اور اسلامی عمارتوں کو خانہ جنگی کے دوران منہدم کردیا گیا، اسلامی قوانین کا دور دورہ یہاں زیادہ دیر تک نہ رہا کیوں کہ تمام شہریوں کو اپنے اپنے مذہبی قوانین کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت تھی، بارہویں صدی میں جب نارمن حکومت کررہے تھے تو بھی سرکاری زبان عربی ہی رہی، کپاس کی کاشت بہت کم ہوگئی کیوں کہ بہت سارے مسلمان کاشت کار سسلی سے دوسرے ممالک میں چلے گئے، ریشم کی انڈسٹری ترقی کرتی رہی، وی آنا کے میوزیم میں ایک ریشم کا چوغہ موجود ہے جس کے اوپر عربی میں کندہ ہے کہ یہ ۱۱۳۳ء میں پالیرمو کی رائیل فیکٹری میں بنایا گیا تھا، اینگلو نارمن رائیل فیملی کے افراد جو لباس پہنتے تھے ان پر عربی میں الفاظ اور نقش و نگار مسلمان کاریگر کرتے تھے۔

سسلی اور اٹلی کے بہت سارے شہروں کے نام عربی کی طرح سے ہیں جیسے پالیرمو (بال

آرم)، مرسالہ (مارہ علی)، کالصہ (الخالصہ)، باتیچی (القریب)، ویتانو (وادی الطین)، سسلی میں ۱۰۰۰ء میں اٹھارہ بڑے شہر اور نو سو گاؤں تھے، پالیرمو کی آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب تھی، عمارتوں پر ابھی بھی عربی میں کندہ الفاظ نظر آتے ہیں، جزیرہ میں پانچ صد کے قریب مساجد تھیں سب سے بڑی مسجد میں سات ہزار نمازی صلوٰۃ ادا کرسکتے تھے، امرا کے محلوں میں ان کی اپنی مساجد ہوتی تھیں۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا بارہویں صدی میں نارمن یہاں حکومت کرنے لگے، بادشاہ راجر اول نے پالیرمو کے شہر کو ۱۰۷۲ء میں فتح کیا تھا مگر وہ جزیرہ کا مطلق العنان حکم راں ۱۰۹۱ء میں بنا، اس کا دور حکومت رواداری کا تھا، اس کی وفات ۱۱۰۱ء میں ہوئی، بادشاہ راجر دوم نے اگلے ۵۳ سال (۱۱۰۱-۱۱۵۳ء) تک حکومت کی، اس کے بعد ولیم اول بارہ سال (۱۱۵۴-۱۱۶۶ء) حکم راں رہا، ولیم دوم تیرہ سال (۹۸-۱۱۶۶ء) حکم راں رہا، اس کے بعد فریڈرک دوم ۵۴ سال (۱۱۹۴-۱۲۵۰ء) تک بادشاہ رہا۔

راجر اول کا شاہی دربار سائنس کا مرکز تھا کیوں کہ اسے اسٹرانومی اور اسٹرالوجی میں بہت دل چسپی تھی، ایک عرب انجینئر نے اسے ایک ٹائم پیس (Clepsydra) بنا کردی، جس میں ایک گھنٹہ مکمل ہونے پر گیند ایک پیتل کے برتن میں خود بہ خود گرتی تھی، اس نے میڈیسن کی تعلیم باضابطہ طور پر شروع کی اور ہر فزیشن کے لئے لازمی قرار دیا کہ وہ ایک رائیل آفیشل کی موجودگی میں اس فیلڈ کے ماہر کے سامنے امتحان دے، یاد رہے کہ پالیرمو شہر میں ۱۱۶۰ء میں سب سے پہلی بار بطلیموس کی فلکیات پر شہرۂ آفاق کتاب مجسطی کا ترجمہ لاطینی میں امیر یوجین (Amir Eugene) نے کیا تھا۔

مشہور جغرافیہ داں ابو عبداللہ الادریسی (۱۱۰۰-۱۱۶۶ء) جب اپنے رشتہ داروں سے ملنے سسلی آیا تو بادشاہ نے اس کو اپنے سائنٹفک اسٹاف کا رکن بنالیا، اس نے دنیا کا گول نقشہ قرص کی صورت میں بادشاہ کی خواہش پر تیار کیا، جس میں یورپ، ایشیا، افریقہ اور بحیرہ روم صاف نظر آتے ہیں، اس نقشہ کی وضاحت کے طور پر اس نے جغرافیہ میں اپنا شاہکار کتاب راجار (Book of Rogers) پندرہ سال میں لکھی، اس کتاب کا دوسرا نام نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق ہے، یورپ میں یہ ۱۵۹۲ء میں منظر عام پر آئی تھی اور پہلا لاطینی ترجمہ ۱۶۱۹ء میں روم سے شائع ہوا

تھا، کچھ سال قبل اس کا نیا ایڈیشن اٹلی سے سات جلدوں میں شائع ہوا تھا، اس نے چاندی ایک گلوب (وزن ۴۰۰ کیلوگرام) پر سات براعظموں، جھیلوں، دریاؤں، بڑے بڑے شہروں، تجارت کے راستوں اور پہاڑوں کی نشان دہی کی، الادریسی نے ایک اٹلس بھی تیار کی جس میں ۷۳ نقشے دیے گئے تھے، اس کی دوسری قابل قدر تصنیف کا نام روض الناس ونزہۃ النفس ہے، درحقیقت یہ دونوں کتابیں سسلی میں عربی زبان کے اعلا لٹریچر کی مثال تھیں، طب میں اس نے جڑی بوٹیوں پر کتاب الجمیع لصفات اشتات النباتات لکھی جس میں دواؤں کے نام بربر، شامی، فارسی، ہندی، یونانی اور لاطینی میں دیے گئے تھے، یورپ میں وہ مسلمانوں کے سب سے بڑے جغرافیہ داں کی حیثیت سے مشہور تھا۔

راجر اول مسلمان علما وفقہا سے بھی تعلقات رکھتا تھا، وہ ایک ماہر جغرافیہ داں تھا، اس کے محل میں مسلمان ماہرین فلکیات، اطبا اور فلاسفہ کا جمگھٹا لگا رہتا تھا، اس کی انتظامی مشنری میں اعلا سرکاری عہدے مسلمانوں کے پاس بھی تھے، عیسائی خواتین پردہ کیا کرتی تھیں اور ریشم کے سفید رنگ کے لمبے جلباب زیب تن کیا کرتی تھیں، وہ اپنے مسلمان ہمسایوں سے عطر مانگ کر استعمال کرتی تھیں، گرجا گھروں کی دیواروں پر نقش ونگار کے لئے قرآن پاک کی آیات کندہ کی جاتی تھیں، تمام سکوں پر اسلامی کیلنڈر (ہجری قمری) کے مطابق تاریخیں ہوتی تھیں اور ان پر اللہ لکھا ہوتا تھا، یورپ کے کسی میوزیم میں ۱۱۰۹ء میں جاری کردہ ایک سرکاری حکم نامہ عربی اور یونانی میں محفوظ ہے جو راجر اول کی بیگم نے جاری کیا تھا، اس نے ایک گرجا گھر تعمیر کرایا تھا جس میں پانچ گنبد تھے اور باہر سے وہ مسجد لگتا تھا، اس نے اپنے محل میں ایک رومن کیتھولک گرجا گھر بنوایا جس میں عرب ڈیزائن کے محراب تھے، اندلس کا مشہور سیاح ابن جبیر (م ۶۱۴ھ) (مصنف رحلہ) جب یہاں آیا تو اس نے عورتوں کو اسلامی لباس میں دیکھا تھا۔

راجر اول کی فوج میں مسلمان سپاہی ہوتے تھے، پاپائے روم کی ناراضگی مول لیتے ہوئے اس نے صلیبی جنگوں میں حصہ لینے سے انکار کردیا تھا جو مقامی لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوجاتے ان کے اسلامی نام کچھ یوں ہوتے تھے، احمد روما، عبدالرحمان بن فرانکو۔

احمد حسن غرناطی قیروان (تیونس) میں پیدا ہوا، اٹلی میں سفر کے دوران اسے غلام بنالیا

گیا تو اس کا نام کانسٹن ٹین دی افریقن (Constanstine the African) رکھ دیا گیا، اس نے سسلی میں بیس سال (۸۵-۱۰۶۵ء) گزارے، اس کا نام اس لئے اہمیت رکھتا ہے کہ وہ جملہ افراد میں سے پہلا عالم اور سائنس داں تھا جس کے ذریعہ اسلامی سائنس یورپ پہنچی، وہ کارتھیج (Carthage) کے شہر سے اپنے ساتھ سالرنو طبی کالج سے (اٹلی) عرب کی طب پر کتابیں لے کر آیا، مانٹی کاسینو (Monte Casino) کے راہب خانے میں اس نے ان کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا جس میں ابن الجزار کی کتاب بھی شامل تھی، اس نے علی بن عباس کی کتاب الکامل فی الصنعۃ الطبیۃ کا ترجمہ کیا جو Pantegni کے عنوان سے شائع ہوا تھا، اس نے افریقہ پر ایک غضب کی کتاب لکھی جس میں افریقہ کے شہروں کے درمیان فاصلے میلوں میں دیئے گئے تھے، افریقہ کے نقشے بنانے والے نقشہ ساز اس کتاب سے بہت فیض یاب ہوئے۔

بادشاہ راجر دوم (۱۱۵۴-۱۱۰۱ء) کا دور حکومت مکمل مذہبی آزادی کا دور تھا، اس کو اسلامی اخلاق اور اسلامی لباس بہت پسند تھا، اس کے شاہی فرمان تین زبانوں یونانی، لاطینی اور عربی میں جاری ہوتے تھے، اس کا لقب الملک المعظم القدیس تھا، اس کے سکوں پر اعداد عربی میں ہوتے اور ان پر الناصر النصریہ کندہ ہوتا تھا، اس کی بحری افواج کے کمانڈر مسلمان ہوتے تھے، اس کے چوغے کے اوپر کوفی رسم الخط میں عربی لکھی ہوتی تھی، یہ چوغہ وی آنا کے میوزیم میں موجود ہے، اس کے وسیع وعریض محل کے اندر عرب شاعر، حرم اور مخنث ہوتے تھے، ایسا لگتا تھا کہ گویا یہ کسی عرب سلطان کا محل ہو، اس کے دربار کے افسران میں حاجب، صلاحی اور جمعدار ہوتے تھے، چیف منسٹر کا لقب امیر الامرا ہوتا تھا، محل میں فتیان (وردی پوش مددگار) ہوتے تھے جو بادشاہ تک رسائی رکھتے تھے جیسے بغداد کے محلوں میں ہوتا تھا، اس کے شاہی طبیب مسلمان تھے، وہ اپنے آپ کو "المعتز باللہ" (Exalted by the grace of Allah) کہتا تھا۔

ولیم اول (۶۶-۱۱۵۴ء) بھی اسلامی علوم وفنون کی سرپرستی کرتا تھا، وہ عربی زبان بڑی روانی سے بولتا تھا، اس کا لقب ہادی بامر اللہ تھا جو سکوں پر کندہ ہوتا تھا، ولیم (۸۹-۱۱۶۶ء) کا رہن سہن کسی عرب سلطان کی طرح تھا، وہ عربی بول اور لکھ سکتا تھا، اگرچہ اس نے صلیبی جنگ میں حصہ لیا تھا مگر اس کے باوجود اس کے دربار میں عرب شاعر، نیگرو باڈی گارڈ اور عرب داشتہ

عورتیں ہوتی تھیں، خزانہ کے محکمہ کے تمام افسر اور کارکن مسلمان تھے، پالیرمو میں مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوتی تھیں، مسلمانوں کے لئے قاضی اور اسکولوں میں مسلمان معلم ہوتے تھے، عیسائی عورتیں اسلامی لباس زیب تن کرتیں، عطر لگاتیں، مہندی لگاتیں اور مشرقی زیورات پہنتی تھیں، بادشاہ خود وہی شاہی لباس پہنتا جو بغداد اور اندلس کے خلفا پہنا کرتے تھے، عربی زبان وہ روانی سے بولتا تھا، اس کی فوج میں مسلمان سپاہی شوخ رنگ کا لباس پہنتے تھے، جب دربار کے مخنث اس کے محل میں نماز ادا کرتے تو وہ ان پر نظر جمائے رکھتا تھا، اس کا شعبہ مالیات (دیوان تحقیق) مصر کے فاطمی خلفا کے طرز پر تھا، بادشاہ راجر دوم نے مسلمان مہندسین سے محاصرے کے لئے منار اور منجنیق بنوائے تھے۔

ملٹری ڈسٹرکٹ کو اقلیم کہتے تھے، اس کے چیف منسٹر کا لقب امیر الامرا تھا، حکومت کے دوسرے افسروں کے نام یہ تھے: صاحب (سکریٹری)، کاتب، عامل (کنٹرولر)، کاشت اور غیر کاشت والی زمینوں کے ریکارڈ کے محکمہ کا نام دفاتری تھا، نماز جمعہ کے اجتماع کی اگرچہ اجازت نہ تھی مگر دو عیدوں پر اجتماع کی اجازت تھی، پالیرمو میں مسلمانوں کے محلہ میں تجارت گہما گہمی سے ہوتی تھی، عدالتوں میں فیصلوں کے لئے مسلمانوں کے لئے قاضی ہوتے تھے، یہاں کے مسلمان اپنی بیٹیاں اسلامی ممالک سے آئے زائرین کو دینا پسند کرتے تھے، ولیم دوم کا ماٹو الحمد للہ حق حمدہ تھا جب کہ اس کا لقب المستعین باللہ تھا جو سکوں پر کندہ ہوتا تھا۔

قیصر فریڈرک دوم (۱۲۵۰ - ۱۱۹۴ء)، سسلی اور جرمنی کا بادشاہ تھا، اس کے دربار میں مشرقی رقاص شاہی مہمانوں کی خاطر مدارات کرتے تھے، جب وہ فلسطین گیا تو اس کے قافلے میں مسلمان بھی تھے، اس کی فوج کا اعلا ترین دستہ لوسیرا (Lucera) کے گیرے زن میں تھا جہاں موذن کے پانچ وقت اذان دینے کی صدا سنائی دیتی تھی، جب اس کی وفات ہوئی تو اس کے کفن پر کوفی رسم الخط میں عربی الفاظ کا نقش و نگار تھا، روم کا پاپائے اعظم اسے بپتسمہ شدہ سلطان (Baptized Sultan) کہا کرتا تھا، اس میں مذہبی تعصب نام کا بھی نہ تھا۔

خدا نے بادشاہ فریڈرک دوم کو تجسس والا دماغ عطا کیا تھا، اس نے موسیٰ بن میمون کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوا تھا، مصر کا سلطان الکامل جو سلطان صلاح الدین ایوبی کا بھتیجا تھا، وہ

بادشاہ کے علمی رتبہ کے پیش نظر اپنے دربار میں شاعروں اور سائنس دانوں میں سے کسی ایک کو سسلی اپنا سفیر بنا کر بھیجا کرتا تھا، ایک جرمن مورخ نے اس کے بارہ میں کہا ہے:

"Frederick had an unstinted administration for the Arab Mind, for he lived in an age when the East was the source of all European knowledge and science ". (E. kontorowicz, Frederick the second, page 186, 1931.)

فریڈرک دوم مسلمان عالموں کے ساتھ علمی مسائل پر گفتگو کیا کرتا تھا، ایک دفعہ اس نے روح اور ابدیت پر عیسائی نقطہ نظر جاننے کے لئے سوالات تیار کئے، وہ مسلمانوں کی طرح باقاعدگی سے غسل کیا کرتا تھا جو عیسائیوں کے لئے اچنبھے کی بات تھی، وہ عالموں کی سرپرستی کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا، چنانچہ ۱۲۲۴ء میں اس نے نیپلز (Naples) میں ایک یونی ورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا، وہ دنیا بھر کے عالموں کو اپنے دربار میں بلا کر ان کو علمی کام سونپتا تھا جو عالم اس کے دربار میں آئے ان میں سے چند ایک یہ ہیں: مائیکل اسکاٹ (Michael Scott)، ماسٹر تھیوڈور (Master Theodore)، لینارڈو فیبو ناچی (Leonardo Fibonacci)، فیبو ناچی نے اسلامی اسپین میں تعلیم حاصل کی تھی اور اٹلی کا ممتاز ریاضی داں تھا، تاریخ میں اس کا نام اس لئے اہم ہے کہ اس نے عربی اعداد کو یورپ میں متعارف کیا تھا، فیبو ناچی نے علم ریاضی پر جو شہرہ آفاق کتاب لکھی وہ فریڈرک دوم کے نام سے معنون تھی۔

بادشاہ فریڈرک دوم کی دل چسپی سائنس اور مذہب میں درج ذیل سوالات سے ہوتی ہے جو اس نے مائیکل اسکاٹ سے پوچھے تھے: ۱- جنت، جہنم اور برزخ ایک دوسرے سے اور زمین کی گہرائی کے مقابلہ میں ٹھیک ٹھیک کس جگہ پر ہیں؟ ۲- زمین پر نمکین اور میٹھا پانی دونوں کیوں ہیں اور وہ کہاں سے نمودار ہوتے ہیں؟ ۳- پانی میں جب اشیا ڈبوئی جاتی ہیں وہ ٹیڑھی کیوں نظر آتی ہیں؟

بچپن میں ہی اس نے عربی زبان سیکھ لی تھی اور اسلامی رسم و رواج سے آشنا ہو گیا تھا، وہ نو زبانیں بول سکتا تھا اور سات میں بڑی آسانی سے لکھ لیتا تھا، جو مترجمین اس کے لئے کتابیں

ترجمہ کرتے وہ ان کی غلطیوں کی نشان دہی کیا کرتا تھا، اس کی شاہی لائبریری میں عربی زبان میں کتابیں کثیر تعداد میں تھیں، اس نے متعدد موضوعات پر رسالے قلم بند کئے جیسے اس نے "شاہین پروری" پر ایک رسالہ لکھا، اس نے گدھوں پر تجربات کرنے کے بعد کہا کہ کرگس اپنی غذا قوت شامہ سے نہیں بلکہ قوت بصارت سے تلاش کرتے ہیں، ایک دفعہ اس نے پلیٹ میں شتر مرغ کے انڈے رکھ کر سورج کی حرارت سے بچے پیدا کرنے کا تجربہ کیا (ڈکشنری آف سائنٹفک بیوگرافی، جلد ۵، ۱۹۷۲ء، ص ۱۴۶)، منطق کی تعلیم اس نے عرب اساتذہ سے حاصل کی تھی، شاہین پروری اس نے ایک عرب مومن سے سیکھی تھی جس نے اس موضوع پر کتاب بھی لکھی تھی۔

اندلس کے ممتاز علما کے علاوہ مشرق وسطی کے بھی علما اور سائنس دانوں سے اس کی خط و کتابت رہتی تھی اور وہ ان سے خطوط کے ذریعہ ریاضی، فزکس، فلاسفی کے مسائل دریافت کرتا تھا، مصر کے سلطان الکامل (۱۲۱۸-۳۸ء) نے مشہور ریاضی داں علام الدین الحنفی کو اس کے دربار میں بھیجا تھا، سلطان کے پاس اس نے سات سوالات بھیجے تھے جن میں تین علم المناظر پر تھے، یہی سوالات اس نے اندلس کے ابن سبعین کو بھی بھیجے تھے، ان میں ایک سوال یہ تھا کہ اس حدیث قدسی کی تشریح کریں کہ مومن کا دل خدا کی دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے؟ ابن سبعین نے ان سوالوں کے جوابات "اجوبۃ اسئلۃ الصقلیۃ" کے عنوان سے لکھے، اس رسالہ کا راقم الحروف نے جولائی ۱۹۹۹ء میں بوڈلین لائبریری (آکسفورڈ) میں سرسری طور پر مطالعہ کیا تھا، فخر الدین شیخ جو ایک ممتاز ماہر فلکیات تھا وہ اس کے دربار میں آیا۔

جب بادشاہ فریڈرک اٹلی اور جرمنی کے سفر پر جاتا تو اس کے قافلے میں جانور بھی بڑے اہتمام سے شامل کئے جاتے تھے، ایک بار وہ اٹلی کے شہر راوینا (Ravenna) ۱۲۳۱ء میں گیا تو اس کے ہم راہ ہاتھی، چیتے، اونٹ، شاہین، ریچھ، شیر، الو، ہندی طوطے، مور وغیرہ تھے، جن کی رکھوالی اس کے غلام کر رہے تھے، جب وہ جرمنی ۱۲۳۵ء میں گیا تو جرمنی کے عوام نے زندگی میں پہلی بار اونٹ، بندر اور چیتے دیکھے، سلطان الکامل نے اسے ایک زرافہ جو تحفہ کے طور پر بھیجا تھا وہ یورپ کے لوگوں نے پہلی بار دیکھا، وہ عربوں کی طرح تحفے لیا اور دیا کرتا تھا، ایک بار سلطان الکامل نے اسے ہاتھی کا تحفہ بھیجا تو اس نے جواباً سفید ریچھ تحفے میں بھیجا جو مصریوں کے لئے نئی

چیز تھی، کیوں کہ وہ صرف مچھلیاں نوش کرتے تھے، شام کے سلطان الاشرف نے ۱۲۳۲ء میں اسے ایک خیمہ نما پلینی ٹریم بھیجا جس میں آسمانی کرے اپنے مدار پر خفیہ میکے نزم کے ذریعہ گھومتے تھے، فریڈرک نے اسے جواب میں ایک سفید ریچھ اور مور بھیجا۔

ایک بار وہ یروشلم گیا تو وہاں اس نے بیت المقدس کی بھی زیارت کی، خاص طور پر وہ اس کے سبز و سنہری رنگ کے گنبد اور منبر سے بہت متاثر ہوا جس پر وہ کچھ دیر بیٹھا رہا، سسلی میں جب اس نے اپنا محل تعمیر کرایا تو بیت المقدس کی عمارت اس کا ماڈل تھی، مائیکل اسکاٹ نے اس کی وفات پر لکھا: "اے خوش قسمت شہنشاہ! میں یقین سے کہتا ہوں کہ اگر اس دنیا میں کوئی شخص موت سے اپنے علم کی بنا پر مفر حاصل کر سکتا تو یقیناً وہ تو ہی ہوتا"۔

یورپ میں اسلامی علوم کی ترسیل: جب آٹھویں صدی سے لے کر تیرہویں صدی تک مسلمانوں کی تہذیب عروج پر تھی تو اس وقت یورپ اپنے تاریک دور (dark ages) میں تھا، خصوصاً اسلامی سپین اور سسلی اس وقت تہذیب کے نقطۂ عروج پر تھے اور اندلس ہی کی ضیا پاشیوں سے یورپ سے بھی جہالت کے تاریک بادل رفتہ رفتہ چھٹنا شروع ہو گئے تھے، قرطبہ اس وقت دنیا کا سب سے ترقی یافتہ شہر تھا، شہر کی سڑکوں پر روشنیاں، پانی کے نکلنے کا انتظام، شہر میں لائبریریاں، اقتصادی خوش حالی، ہر طرف باغات، پھول بوٹے، کشادہ مکان اور کھانے پینے کی بہتات تھی، اس وقت لندن کی سڑکیں کچی، پیرس کے مکان بوسیدہ اور پورے یورپ میں ایک لائبریری تھی، لندن، پیرس سے طالب علم یہاں تحصیل علم کے لئے آیا کرتے تھے اور یورپ کے شاہی خاندانوں کے افراد یہاں علاج کے لئے آتے تھے، ایک مغربی اسکالر کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

" The Size and opulence of 10th century Cordoba far outsripped any city in the Latin West, and the contrast beteween the scientific cultures of al-Andalus and Europe ws just an extreme". (Charles Burnett, Introduction of Arabic learning into Europe, 1997, pages 3)

بارہویں صدی میں یورپ میں جو نشاۃ ثانیہ کی تحریک شروع ہوئی اس میں اندلس کا

رول بہت اہم اور بنیادی تھا، سائنس اور فلسفہ پر عربی کی تمام کتابوں کے تراجم اندلس کے شہر ٹولیڈو میں کئے گئے اور یہاں سے یہ یورپ پہنچے، جب لندن، پیرس، پیڈوا، وینس، مانٹ پیلیر کے شہروں میں یونی ورسٹیاں شروع ہوئیں تو ان کے نصاب تمام کے تمام ان عربی کتابوں کے تراجم تھے، سسلی میں عرب، یونانی اور لاطینی کلچرز کے ملاپ سے جس نئی تہذیب نے جنم لیا وہ فقید المثال تھی، پالیر موشہر کے لوگ تین زبانیں بولتے تھے، سسلی میں نارمن بادشاہت اور اٹلی میں نشاۃ ثانیہ ایک ہی عہد میں شروع ہوئے، اٹلی میں نشاۃ ثانیہ کے برپا ہونے کی وجہ اندلس اور سسلی کے کلچرز اور علمی تہذیب کا یہاں زبردست اثر تھا، اسلامی تہذیب کی ترسیل یورپ کو عربی اور اسلامی کتابوں کے تراجم اور نئے سائنسی آئیڈیاز کے ذریعہ ہوتی تھی، اس طرح وہ سسلی سے اٹلی اور وہاں سے جرمنی اور فرانس پہنچی، اٹلی کے یونی ورسٹی بولونیا (Bologna) میں بادشاہ کے حکم پر منطق اور فزکس میں عربی کتابوں کے تراجم پورے زور شور سے کئے گئے، فریڈرک دوم نے جب یونی ورسٹی آف نیپلز کی بنیاد رکھی تو اس نے اپنی تمام عربی کی کتابیں یہاں تحفتاً دے دی تھیں، فریڈرک نے ہی سالرنو (Salerno) کے اسکول آف میڈیسن میں اناٹومی کے شعبہ کو شروع کیا تھا، غرضیکہ سسلی نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں جو کردار ادا کیا وہ مسلمہ ہے۔

ہندوستان میں عربی ادبیات

از:- پروفیسر محمد اجتبا ندوی☆

(۳)

مولانا احمد رضا خاں قادری بریلی کے کثیر التصانیف فقیہ و شاعر تھے، ان کی تصانیف بقول ڈاکٹر قریشی مجموعی شکل میں دست یاب نہیں ہیں، ان کی کچھ نعتیں ہیں جن کو تبصرہ و ترجمہ کے ساتھ (مولانا احمد رضا خاں کی عربی زبان و ادب میں خدمات) کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔

مولانا خاں صاحب کی وفات کے ۸۰ سالہ یادگار جلسۂ تعزیت کے موقع پر مصر کے ادیب و جامعہ عین شمس میں ممالک غیر کی ادبیات کے استاذ ڈاکٹر حسین مجیب مصری نے عربی میں ۱۹۹۹ء میں مقالہ لکھا تھا، ان دونوں مذکورہ حوالوں سے چند منتخب حمد و نعت سے متعلق اشعار ذکر کئے جاتے ہیں، مولانا خاں صاحب عربی، اردو اور فارسی میں اشعار کہتے تھے اور کبھی تنوع و تفنن کے طور پر تینوں زبانوں کو ملا کر نعت منظوم کی ہے۔

الحمد لله رب الكون والبشر
حمدا يدوم دواما غير منحصر
الا تعالى الى المختار من مضر
صلى الاله على المختار من مضر
ان شئت انهض الى الفاروق نسأله
فالحق يظهر من الفاظه العرر
صلاة ربي دائما وعلى
خير البرية سيد الاكوان

☆ المرکز العلمی، مصطفےٰ منزل، گل مہر ایونیو، اے ۱/۳۰، تکونہ پارک، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

صلی المجید علی الرسول و فضله

محبه و مطیعه بحنان

مولانا مفتی کفایت اللہ شاہ جہاں پوری: مولانا ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے مفتی اعظم کی ادبی وسیاسی شخصیت سے متعلق کتاب لکھی ہے، مفتی صاحب تحریک آزادی کے چوٹی کے رہنما بھی تھے اور فقیہ ومفتی بھی تھے، ان کی تصانیف بھی ہیں، روض الریاحین کے عنوان سے ایک طویل نظم ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں:

عرفت اللّٰه ربی من بعید

فکم بین الاله والبعید

عرفت اللّٰه ربی من قریب

اشد القرب من حبل الورید

قریب رحمة منا و علما

بعید فی اکتناه عن بعید

مولانا عبدالمنان (۱۹۲۲ / ۱۹۷۳ء) دہلی میں قیام تھا، مدرسہ سبحانیہ کے بانی مولانا عبدالسبحان میواتی کے فرزند اکبر تھے، غیر معمولی ذہین اور حافظہ غضب کا تھا، عربی، فارسی، اردو کے لاتعداد اشعار یاد تھے، سنانے پر آتے تھے تو بحر بے کنار لگتے تھے، شعر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے، دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کی، مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب کے مدرسہ امینیہ دہلی میں شاگرد تھے، شعروادب میں مولانا عبدالحق مدنی سے استفادہ کیا، معروف بزرگ مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری سے اصلاح وتزکیہ حاصل کیا اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی سے بیعت تھے، صاحب دیوان تھے، مخطوطہ ہے، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی وفات پر مرثیہ کہا جس کا عنوان ''عبرات وزفرات'' ہے:

شمس الهدی و الدین و العرفان

غابت وما طلعت! فیا حرمانی

یا من یحب حسین احمد، حسبکم

ما جاء فی الآثار، و القرآن

صبرا، فان الصبر، مفتاح النجاح

من الکمال و زینة الانسان

للّٰه ما اعطی، و ما هو آخذ

بقضاءه فی عالم الامکان

ڈاکٹر شفیع الرحمان سابق ریڈر شعبہ عربی دہلی یونی ورسٹی بنگال میں پیدا ہوئے، عربی تعلیم اپنے علاقہ میں حاصل کی، تکمیل دہلی یونی ورسٹی میں کی اور شعبہ عربی میں تدریسی خدمات سے وابستہ ہوگئے، اس وقت لائق وممتاز محقق اور صاحب قلم پروفیسر خورشید احمد فارق صدر شعبہ عربی تھے، شفیع الرحمان ان کے خاص شاگرد ہوئے اور ادب، نحو اور فن شعر میں بڑی لیاقت پیدا کی، سیدھے سادے، بے نیاز ومتوکل شخصیت کے مالک ہیں، دہلی ہی میں قیام ہے، استاذ خورشید فارق صاحب کے مرثیہ کے چند شعر ملاحظہ کریں:

جرت ادمع من عینی المتظلم

بجور الزمان الغاشم المتحکم

و بتنا علی شوک القتاد تململا

لهول سری نحو البلاد کأرقم

رأیت المنایا کم تجول بشرة

تصول علی اهل العلوم کضیغم

فصبر جمیل للآسی و ضرابه

بشکل تبدی بالبکا کل عالم

مولانا سید طاہر رضوی قادری: شیخ الجامعۃ النظامیہ حیدرآباد اور سابق استاذ شعبہ عربی جامعہ عثمانیہ، علم وفضل کے ساتھ شعر گوئی پر قدرت ومہارت تھی، چند شعر درج ذیل ہیں:

الا ان الاله له البقاء

و ان الخلق شأنهم العناء

فلا یخفی علیہ کل شئی

ھو القھار یفعل مایشاء

و نرجوہ السلامۃ والنجاۃ

و نسأل مالنافیہ الشفاء

نعت کے دوشعر ملاحظہ ہوں:

الا وھو النبی الھاشمی

ومنہ الابتداء والانتہاء

لکل من نبی او رسول

مراتب دونہ ولہ العلاء

معلوم ہوا کہ مظاہر علوم سہارن پور کے مولانا اطہر سعیدی صاحب صاحب دیوان شاعر ہیں اور تاریخ ہند و تاریخ مظاہر سے متعلق ان کے طویل قصیدے یا مثنویاں ہیں مگر تلاش، جستجو اور رابطہ قائم کرنے کے باوجود بہ طور نمونہ بھی اشعار نہ مل سکے۔

ادھر چند برسوں سے سرکاری یونی ورسٹیوں کے شعبہ ہائے عربی میں مختلف ادبی (قدیم و جدید) موضوعات سے متعلق اچھے سمینار ہوتے ہیں اور تحقیقی و علمی مقالات بھی پڑھے جاتے ہیں۔

جنوبی ہند: ہم نے گذشتہ صفحات میں جنوبی ہند کے ذکر میں عربی زبان و ادب سے وابستگی اور تصنیفات کا کسی قدر تعارف کرایا ہے، احمد آباد گجرات میں مقیم عیدروس یمنی گھرانہ کا جنوب سے مسلسل تعلق قائم رہا جس کی بنا پر علمی و ادبی خدمات جاری رہیں، کیرالا، مدراس، تامل ناڈو، کرناٹک اور حیدرآباد میں بھی عربی ادبیات کے وسیع معنی میں کتابیں تصنیف کی گئیں، خصوصیت سے تاریخ و فقہ اسلامی بنیادی موضوع رہا، کیرالا کے مشہور علما میں مندرجہ ذیل شخصیات نے اپنی نگارشات سے فائدہ پہنچایا، علامہ احمد شیرازی، احمد کوئی سلیار کوننگری، نیگل احمد کٹی سلیار، احمد کویا شالیاتی، زین الدین مخدوم کبیر، زین الدین مخدوم صغیر، زین الدین مخدوم اخیر، قاضی محمد قطبی مسلیار، نیلیکوٹ مرکار مسلیار، ۷۸۹ھ میں عبداللہ بن احمد مالاباری اپنے دو بھائیوں قاسم و ابوبکر کے ساتھ مکہ مکرمہ گئے اور حدیث کی سند حاصل کی، ان سے قبل عبداللہ مالاباری دمشق گئے

اور حدیث و ادبیات میں استفادہ کیا، عرب ممالک کے علما دور اول کے بعد کیرالا آئے اور وہاں کے مراکز و مدارس کو فیض یاب کیا، ان میں سے ایک معروف نام عبدالکریم ابراہیم جیلی کا ہے، مذکورہ علما نے گراں قدر تصنیفات لکھیں، ان میں شیخ احمد زین الدین معبری مخدوم صغیر کی جامع اور مفید کتاب (فتح المعین) ہے جس کو مولف نے ۱۷ ابواب میں تقسیم کیا ہے اور دوسری فقہی کتابوں کے طرز سے الگ اس کا پہلا باب (کتاب الصلاۃ) ہے، اس کی شرحیں اور حواشی بھی لکھے گئے ہیں، کیرالا میں یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور عرب ممالک میں بھی اس کی اہمیت ہے، ایک فقیہ یمنی شاعر نے اس کے بارے میں یہ اشعار لکھے ہیں:

یا من یرید النجاحا

وللعلوۃ افتتاحا

فتح المعین لازم

لہ مساء و صباحا

واجعلنہ خیر سیر

تعط الھدی والفلاحا

غص فی معانیہ

تلق کنوز فتوی صحاحا

جو شخص کامیابی و سربلندی چاہتا ہے، اسے صبح و شام (فتح المعین) کو پڑھنا چاہئے، اسے بہترین نمونہ بنالو تمہیں رہنمائی اور کامیابی ملے گی، اس کے معانی کی گہرائی تک پہنچوگے تو صحیح فتووں کے خزانے دست یاب ہوں گے۔ (۱)

اس کتاب (فتح المعین) پر تحقیقی پی ایچ ڈی کا رسالہ ڈاکٹر ای احمد کٹی سابق پروفیسر و صدر شعبہ عربی کالی کٹ یونی ورسٹی کے زیر نگرانی ڈاکٹر عبدالرزاق ایم نے کیا، کیرالا نے دور جدید میں علمی و ادبی میدان میں بڑی ترقی کی ہے، اس کا جائزہ پیش کیا جائے گا، بالکل اسی طرح مدراس میں بھی ترقی کی رفتار رہی ہے، حیدرآباد کی نوعیت جنوب کے علاقوں میں مختلف ہے، علم و ادب کا مرکز رہا ہے اور آصف جاہی عہد کے بعد اس کے فیوض و برکات نے سرحدوں کو پار کر کے

پورے عالم کو مالا مال کیا ہے، دائرۃ المعارف عثمانیہ، جامعہ نظامیہ اسلامیہ، جامعہ عثمانیہ مکتبہ آصفیہ اور عصر جدید کے ادارے، مدارس اور اداروں کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں، پروفیسر محمد سلطان محی الدین صاحب نے اپنی بلند پایہ تصنیف (**علماء العربیۃ و مساھماتھم فی الادب العربی فی العھد الآصف جاھی**) "آصف جاہی عہد میں عربی زبان کے علماء عربی ادب کا عربی میں حصہ ۱۸۴۸ سے ۱۹۴۸ء تک" میں رقم طراز ہیں:

"حیدرآباد نے اپنی ترقی یافتہ ثقافت اور قدیم اسلامی تہذیب اور مملکت نظام" کی جانب سے علما، شعرا اور انشا پردازوں کی پذیرائی و اعزاز کی بنا پر شہرت و نام وری حاصل کی، اس کتاب میں عزیز قاری کو عربی زبان و اسلامی ثقافت کے سلسلہ میں علما کی دینی و عربی خدمات، کارناموں، تصنیفات، تخلیقات کے بارے میں وافی معلومات ملیں گی۔ (۲)

کتاب کے دوسرے باب میں دور اول سے تالیف کتاب تک ۶۲ علما کا تذکرہ ہے جن میں اکثر نام ور اور اصحاب تصنیف ہیں، بہ طور مثال چند نام پیش ہیں:

مولانا شاہ شجاع الدین (۱۱۹۱/۱۲۶۵ھ) ۱۲۱۶ھ میں برہان سے حیدرآباد آئے اور تعلیم و تدریس کے ساتھ رشد و ہدایت کا بھی سلسلہ رہا، حیدرآباد کی جامع مسجد میں (مدرسہ شجاعیہ) کے نام سے عربی و دینی تعلیم کے لئے مدرسہ قائم کیا، عربی زبان میں چند منظوم اور منثور رسالے ہیں، فقہ سے متعلق (جوہر النظام)، (کشف الخلاصہ)، فقہی مسائل اور دو رسالے جبر و قدر اور سماع کے بارے میں ہیں۔

مولانا شمس الدین (۱۲۱۴ / ۱۲۸۳ھ) حیدرآباد کے فضلا میں تھے نقلی و عقلی علوم کے تفوق کے ساتھ عربی زبان و قواعد میں دست گاہ رکھتے تھے، اپنے علم و فضل اور خوش گفتاری کی وجہ سے قدر و منزلت حاصل کی، درج ذیل کتابیں تصنیف کیں: شمس النحو، الصرف، خزانۃ الامثال اور علم البلاغۃ میں ایک رسالہ، مولانا ابوالرجا محمد زمان خاں شہید (۱۲۴۲ / ۱۲۹۲ھ) حیدرآباد کے ممتاز علما میں تھے، عربی، فارسی، اردو میں یکساں مہارت رکھتے تھے، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تلامذہ سے علم حاصل کیا، علم و فضل کے ساتھ دینی و اخلاقی غیرت و حمیت کے مالک تھے، مسجد میں نماز و تلاوت میں مشغول تھے کہ اچانک ایک مہدوی نے حملہ کرکے شہید کردیا، ان کی عربی

تصنیفات میں ان کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے: "خیر المواعظ" دو حصوں میں "سفینۃ البلاغۃ" اس کتاب اور ان کے بارے میں، بحر العلوم مولانا عبدالعلی آسی نے بلند کلمات لکھے ہیں، ابوالخیر محمد جان نے شعر میں تعریف و تحسین کی ہے۔

ہم نے بہت اختصار کے ساتھ عربی ادبیات سے متعلق گفتگو کی ہے، جس کا تعلق عربی شاعری کے علاوہ پوری گفتگو کا محور قدیم عربی ادبیات تھا، البتہ جو تدریجی اثرات نمایاں ہوئے ان کی جانب بھی اشارہ کرتے رہے ہیں، ہم نے شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے شاگردوں اور مکاتب فکر کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے عربی الفاظ کی بازی گری، صنعت، مسجع و تکلف کی منزل سے سادگی، سلاست، روانی اور شگفتگی اختیار کرنے کی کوشش شروع کردی جو عربی زبان کا اولین مزاج و روح تھا اور اس جیسے دوسرے قدرتی اسباب نے نئی صبح کی خبر دی اور عصر جدید کی روشن کرنیں دور افق پر چمکتی محسوس ہونے لگی تھیں لیکن ابھی قدرت کی طرف سے ایک امتحان باقی تھا، ادھر عثمانیوں پر قہر غم ٹوٹا کہ عرب و ہندوستان مشرقی ممالک مغربی سامراج کے شکار ہوگئے اور ادبیات کا تخت رواں چند لمحوں کے لئے بہ ظاہر ٹھہر سا گیا، تاہم اہل علم اور اصحاب فکر و دانش مایوس و شکستہ قلم نہ ہوئے، انگریزی سامراج نے ان ہی کے کچھ رفقا کو جلا وطن کیا اور تختہ دار پر چڑھایا اور کچھ کو شہر بدر کیا، علامہ فضل حق خیرآبادی، مولانا عنایت احمد کان پوری اور مولانا جعفر تھانیسری کو ملک بدر اور صادقین صادق پور کی چند نفوس قدسیہ کو شہید کیا، شہادت کے اس اعزاز سے کچھ اہل فکر و دانش کو نوازا گیا لیکن یہ بھی حق ہے کہ خون صد ہزار انجم ہی سے سحر پیدا ہوتی ہے، علما، ادیبوں اور شاعروں کے لئے یہ آزمائش نئی نہیں تھی، اس مشکل گھڑی میں بھی ان کے پایہ ثبات کو لغزش نہیں ہوئی، وہ تاریکیوں سے بھی قلب و عقل کے نور سے روشنی حاصل کرلیتے ہیں، مارچ ۱۹۵۶ء کی ایک صبح مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ہم رکابی میں یہ راقم سطور دمشق (شام) کی عربی علمی اکیڈمی کے سربراہ جناب خلیل مردم بک سے اکیڈمی کی قدیم عمارت عادلیہ میں ملاقات کے لئے گیا، ایک کونے میں بیٹھ کر ان عظیم ارکان فکر و ادب کی گفتگو سننے لگا، دوران گفتگو خلیل مردم نے کہا کہ اکیڈمی کے بانی و پہلے سربراہ جناب محمد کرد علی کہا کرتے تھے کہ ہم نے ۲۱-۱۹۲۰ء میں فرانسیسی سامراج کے دوران جتنے تحقیقی کام اور بلند پایہ کتابیں اکیڈمی سے شائع کیں بعد میں نہ

کر سکے، توپوں کی گھن گرج اور فوجی گاڑیوں کی گھڑ گھڑاہٹ ہمارے کانوں میں آتی رہتی تھی، مگر ہم اپنے کاموں میں بے نیازی سے مشغول رہتے تھے، پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں تاتاری ٹڈی دل بن کر تاخت و تاراج کر رہے تھے اور وہی دور ہے کہ اسلامی و عربی علوم کی عظیم الشان کتابیں تصنیف کی گئیں، کچھ ایسا ہی حال ہمارے اس عزیز ملک میں پیش آیا، خانوادۂ ولی اللہ کے خوشہ چیں و تربیت یافتہ علما مولانا مملوک علی اور مفتی صدر الدین آزردہ کے شاگرد مولانا محمد قاسم نانوتوی، سرسید احمد خاں اور ان کے بعد مولانا محمد علی مونگیری، علامہ شبلی، ملا عبدالقیوم، مولانا انوار اللہ خاں اور سید حسین بلگرامی نے وہ عظیم کارہائے نمایاں انجام دیے جسے ہندوستان کی علمی و ادبی تاریخ فراموش نہیں کر سکتی، یہ اسی قدیم کاروان ادبیات کا تسلسل تھا اور اسی کا یہ فیض تھا کہ عصر جدید کی روشن کرنیں نمودار ہوئیں، ہم بجا طور سے کہہ سکتے ہیں:

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دیوانہ دار آید بروں

میرے کوتاہ قلم نے جن شخصیتوں کے اسمائے گرامی رقم کئے ہیں وہ تنہا ایک انجمن تھے، جنہوں نے یہ ادارے اسی گہری تاریکی سے نکل کر قائم کئے جنہیں ہم آج دار العلوم دیوبند، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، جامعہ نظامیہ اسلامیہ، جامعہ عثمانیہ اور دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد، دار المصنفین اعظم گڈھ و ندوۃ المصنفین دہلی کے لائق افتخار نام سے یاد کرتے ہیں، یہ سب کچھ انیسویں صدی عیسوی کے آخر اور بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں رونما ہوا، ٹھیک یہی گھڑی ہے کہ جب عصر جدید کا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ عرب و ہند کے آسمان پر بیک وقت طلوع ہوا، اس کے بعد کے تمام ہزاروں ادارے اور دانش گاہیں اسی کا عکس اور پرتو ہیں، ہم آپ کی اجازت سے ایک لمحہ ٹھہر کر گذشتہ باتوں پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔

ہم نے عربی ادبیات کی قدر و قیمت اور وزن و معیار پر کچھ زیادہ غور نہیں کیا، نصاب تعلیم کو بھی زیادہ زیر بحث نہیں لائے، اس سلسلہ میں مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی نے پہلے اور عصر حاضر میں عہد بہ عہد و منزل بہ منزل دو ماہرین نصاب تعلیم مولانا سید محمد واضح رشید صاحب معتمد

تعلیم ندوۃ العلما لکھنؤ اور پروفیسر محمد اقبال حسین صدر عربی مرکز سیفل حیدر آباد نے عربی زبان میں (مناهج الدراسات العربية في الهند) پر کتابیں تحریر کیں، یہ اپنے موضوع پر بے حد عظیم اور وقیع کام ہے، اس سے پورا اندازا ہوجاتا ہے کہ عربی ادبیات کی نوعیت کیا تھی، اورنگ زیب عالم گیر کے آخری عہد میں ملا نظام الدین سہالوی نے ایک مرتب و منظم نصاب تیار کیا، تاہم وہ اس دور کی روایت اور مزاج سے ہی ہم آہنگ رہا، فرنگی محل بیسویں صدی کے نصف تک اس کا مرکز رہا، دوسرے عربی مدارس اسی ہی نہج پر گامزن رہے، شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی ایک نصاب تیار کیا تھا مگر وہ رائج نہ ہوسکا۔

دار العلوم دیوبند ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا جسے مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے اپنے رفقا کے ساتھ قائم کیا اور نصاب ''درس نظامی'' ہی کے مطابق قائم رکھا، دو ایک کتابوں اور موضوعات میں رد بدل کیا گیا ہوگا، دار العلوم نے اس وقت سے اب تک بڑی خدمات پیش کی ہیں، اہم شخصیتوں اور ان کی تصنیفات نے بڑا فائدہ پہنچایا، ان میں چند نام پیش ہیں جن کی خدمات و کارنامے روز روشن کی طرح عیاں ہے، مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳ھ - ۱۹۴۳ء) ان کی تصنیفات کا ذکر گزر چکا ہے، مولانا حبیب الرحمان اعظمی (۱۹۰۱ء) ممتاز محدث تھے، مسند ابی شیبہ، مسند حمیدی اور کئی حدیث کے کتابوں کی تحقیق شرح اور تصنیف کیں، مولانا خلیل احمد سہارن پوری (۱۸۵۲ - ۱۹۲۷ء) فن حدیث میں امتیازی مقام رکھتے تھے، مدینہ طیبہ میں وفات پائی اور بقیع میں دفن کئے گئے، ان کی سب سے اہم کتاب (ابوداؤد کی شرح بذل المجہود) بہت مقبول ہوئی، ان ہی کے شاگرد اور عظیم محدث و مرشد مولانا محمد زکریا نے اس سلسلہ کو جاری رکھا اور خدمت حدیث نبوی کے تسلسل کو حضرت شیخ مولانا محمد زکریا کے لائق و ممتاز شاگرد مولانا ڈاکٹر شیخ تقی الدین مظاہری ندوی ازہری نے کئی گراں قدر مولفات عالم عرب سے شائع کر کے قائم رکھا ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے (۱۹۰۲ - ۱۹۸۵ء) عصری تعلیم بھی حاصل کی اور مدرسہ عالیہ کلکتہ اور اس کے بعد مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات کے صدر ہوئے، غیر معمولی ذہین تھے، ایک اردو رسالہ (برہان) کے اڈیٹر تھے، ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف

تھے اور ان کے چند مقالات عربی میں بھی ہیں، ان کے علاوہ کئی علما نے حدیث، فقہ، تفسیر اور ادب سے متعلق کتابیں اور مقالات لکھے، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا ذوالفقار علی اور مولانا اعزاز علی صاحب کا ذکر آچکا ہے، انہیں شیخ الادب کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، انہوں نے نصاب کی کتاب (نفحة العرب) مرتب کی اور عربی دواوین (متنبی و حماسہ) کی شرحیں لکھیں اور حاشیے تحریر کیے، مدرسہ عالیہ کلکتہ کے اساتذہ میں مولانا حمید الدین شیخ الحدیث اور ممتاز محقق و ادیب مولانا معصومی اور استاد ادب مولانا محبوب الرحمان ازہری روشن نام ہیں۔

یہ وہ دور ہے کہ جب یورپ میں پریس ایجاد ہو جانے کے بعد علم و ادب کے میدان میں حیرت انگیز طور سے علمی، ثقافتی اور تمدنی انقلاب آیا، اس کا اثر عالم عربی نے قبول کیا، عربی کی قدیم اور دور اول کی کتابیں جو مخطوطے اور مسودوں کی شکل میں تھیں، زیور طبع سے آراستہ کی گئیں، عرب علما و ادبا نے اسے پڑھ کر اور یورپ کے طرز تالیف اور ادبیات سے متاثر ہو کر اسلوب بیان اور طرز تحریر میں سادگی اور شگفتگی کی طرح ڈالی، مگر ہمارے یہاں علما اسی طرز کہن پر قائم رہے، اس کے بعد ندوۃ العلما کی تحریک ۱۸۹۲ء میں قائم ہوئی اور اس کے بانیوں نے اپنے مقاصد میں (علوم اسلامیہ کے نصاب میں دور رس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری اور رفع نزاع باہمی یعنی اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا) لازمی قرار دیا (۳)، اس فیصلہ میں ملک کے تقریباً تمام بڑے علما و دانش ور شامل تھے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی عربی کتاب (المسلمون فی الهند) میں ندوۃ العلما کے قیام کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"ندوۃ العلما اور اس کے زیر نگرانی دارالعلوم کا مقصد اعتدال اور درمیانی راہ" اختیار کرنا ہے، صالح قدیم روایت اور نفع بخش جدید قدروں سے فائدہ حاصل کرنا اور ابدی دین (جس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی) کے اور اس علم (جو ہمیشہ تغیر و تبدل و ترقی پذیر ہے) کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنا ہے، یہ تحریک پہلے دن سے ہی اس یقین پر قائم ہوئی کہ اسلامی علوم "زندہ اور ترقی پذیر ہیں اور نصاب درس تجدید و ارتقا کے قانون کے تابع ہے، اس لئے ہر زمان و مکاں میں تجدید و اصلاح ضروری ہے، زمانہ کی تبدیلی اور مسلمانوں کے حالات و ضرورت کے مطابق

اس میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے (۴)، مولانا سید عبدالحی حسنی نے (نصاب اور اس کے تغیرات) میں نصاب کی جانب خصوصی توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے کہ تبدیلی حالات کے مطابق ناگزیر ہے اور عربی زبان و ادب کی تعلیم ضروری ہے کیوں کہ (حدیث و تفسیر کو ادب و عربیت سے مدد حاصل ہوتی ہے)، علامہ شبلی بھی عربی زبان و ادب کی تعلیم پر خصوصی توجہ مبذول کرنے پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک نقص یہ ہے کہ منطق کی کتابیں جو درس میں داخل ہیں، ان میں خلط مبحث بہت ہے، ملا حسن قاضی ہے تو منطق میں لیکن ان میں منطق کے جس قدر مسائل ہیں کہیں زیادہ امور عامہ اور فلسفہ کے مسائل ہیں، اس نصاب میں ادب و عربیت کا حصہ بہت کم ہے، ایک طالب علم نے ادب سرے سے نہ پڑھا ہو، عربی زبان میں دو سطریں نہ لکھ سکتا ہو، قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کو بیان نہ کر سکتا ہو تو اس کے چہرۂ کمال پر کوئی داغ نہیں، حالاں کہ ادب و عربیت کے بغیر تفسیر و حدیث کسی میں کمال پیدا نہیں ہو سکتا، اس بنا پر ادب سے بے اعتنائی علوم دینیہ سے بے اعتنائی ہے"۔(۵)

ندوۃ العلما کے پہلے ناظم مولانا سید محمد علی مونگیری نے عربی زبان و ادب کی تعلیم پر زور دیتے ہوئے کہا" آج کل کے طلبہ بلکہ اکثر علما کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی آجائے تو اس سے پانچ منٹ تک محاورۂ عربی میں بات چیت نہیں کر سکتے ہیں (۶)، اسی بنا پر ایک بزرگ نے فرمایا کہ (ہمارے علما عربی کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں مگر (عربی نہیں جانتے ہیں) اکابر ندوۃ العلما اور اس کے معماروں نے ایک نیا نصاب تیار کر کے سادہ، شگفتہ اور دلآویز اسلوب اختیار کرنے کے لئے فضا تیار کی جس سے جدید اسلوب ابھر کر آیا، انہوں نے نثر نگاری میں ملکہ پیدا کرنے پر اصرار کیا کیونکہ نثر تعبیر و ترجمانی کے لئے زیادہ مفید ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں:

(تحریر و تقریر کی مشق عربی میں ترجمانی اور اظہار مافی الضمیر میں جو چیز مفید ہے وہ نثر ہے نہ کہ نظم، نظم پابہ زنجیر ہوتی ہے اور مقید اگر چہ نثر بھی ہمارے یہاں نظم سے کچھ کم نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں جو قافیہ بندی اور تکلف و صنعت داخل ہوگئی ہے، اس نے ادب کو بھی نظری علوم کی

طرح بنادیا ہے جو پڑھائے جاتے ہیں لیکن برتے نہیں جاتے ہیں''۔(۷)

علامہ شبلی نعمانی نے ۱۸۹۲ء میں مصر وشام وترکی کا سفر کیا، مصر میں اس دور کے نام ور اہل قلم ادبا اور صحافیوں علی پاشا مبارک، امین بک فکری، شیخ حمزہ فتح اللہ اور شیخ محمد عبدہ سے ملاقات کی اور عربی زبان وادب اور علوم وفنون پر ان سے تبادلہ خیال کیا، ادبا وصحافیوں سے مل کر عربی زبان کی نئی تعبیرات، نئے الفاظ، نئے اسالیب سے واقفیت حاصل کی اور اپنی تحریر کو اس سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔(۸)

یہ اور ان کی سعی مشکور نے دارالعلوم ندوۃ العلما میں علوم اسلامیہ کے ساتھ عربی ادب اور عربی تحریر وتقریر میں قدرت حاصل کرنے کا شوق پیدا کردیا اور ندوہ کے پہلے طالب علم سید سلیمان نے ندوہ کے دوسرے اجلاس میں عربی میں تقریر کی اور مصری اخبار پڑھ کر سنایا تو حیرت کے ساتھ ستائش ومبارک باد کے لئے مجمع ٹوٹ پڑا، علامہ شبلی مصر سے صادر ہونے والے اخبار میں مضامین لکھتے تھے اور مشہور مورخ ادب وتاریخ جرجی زیدان کے رد میں ''کتاب الجزیہ'' عربی میں تصنیف کی، مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی علامہ شبلی کے ذریعہ مصری رسالوں کو پڑھنا شروع کیا، ممکن ہے مصری رسالہ (الہلال) کے نام پر اپنے اردو رسالہ کو جاری کیا ہو، علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی عربی میں مقالات اور عربی میں نظم وقصائد بھی لکھے ہیں، انہوں نے (لغات جدیدہ)، (دروس الادب) عربی طلبہ کے لئے لکھی، ندوۃ العلما سے عربی ماہنامہ (الضیاء) ان کی نگرانی اور مولانا مسعود عالم صاحب کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا تو انہوں نے اداریے اور مقالات لکھے، ادبی مقالات کے علاوہ عربی میں نظمیں وقصائد بھی لکھے ہیں، اس مقالہ میں نمونے اور مثالیں پیش کرنے کی گنجائش نہیں ہے، تفصیلات کے لئے ڈاکٹر سلمت ریحانہ کی کتاب (عربی زبان وادب کے ارتقا میں سید سلیمان ندوی کی خدمات) میں ملاحظہ کریں، سید سلیمان ندوی کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلما میں ان کے لائق اور ممتاز شاگردوں مولانا محمد ناظم صاحب، مولانا مسعود عالم، مولانا عبدالرحمان کاشغری اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی عربی تقریر وتحریر اور مقالات وتصنیفات کے ذریعہ پورے ملک میں ایک ایسی عربی زبان وادب کی فضا قائم کردی کہ وہ ادارے، مدارس اور مراکز علم ودین جو قدیم عربی کتابیں (برکت) کے طو[illegible] پڑھاتے تھے، عربی زبان، انشا اور صحافت کی جانب متوجہ ہوگئے،

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ندوۃ العلما میں تفسیر وادب کے تدریس کے زمانہ میں اور پھر اپنی معتمدی ونظامت میں خود بھی اور اپنے شاگردوں کے ذریعہ عربی زبان میں نصاب درس تیار کرایا، خود بڑا ہی جامع اور شاہکار ادبی انتخاب (مختارات من ادب العرب) تیار کیا، ۱۹۵۷ء میں دمشق سے اس کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا، راقم سطور اس کا ایک نسخہ علامہ شام شیخ محمد بہجت البیطار کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا، ورق گردانی، اس کے بعد چند حصے غور سے پڑھے اور بے ساختہ فرمایا، شان دار، بڑا اعلا ادبی انتخاب ہے، شیخ ابوالحسن کا ادبی ذوق بہت اعلا ہے، بچوں کے لئے ادبی نصاب (قصص النبیین، القراءۃ الراشدۃ، النبی الخاتم) پر مشتمل ہے، مختارات سمیت یہ سب کتابیں کئی عرب ممالک کے نصاب میں شامل کی گئیں، اس کے بعد مولانا رحمہ اللہ نے تاریخ وادب، فکر اسلامی، مسائل حاضرہ، اخلاق وربانیت سے متعلق ۸۰ سے زیادہ عربی زبان میں کتابیں لکھیں جن میں ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، الارکان الاربعۃ، النبوۃ والانبیاء، روائع اقبال، السیرۃ النبویۃ اور الطریق الی المدینۃ لکھ کر اپنے اسلوب، طرز بیان اور عربی انشاپردازی میں عرب کے چوٹی کے ادبا سے خراج عقیدت حاصل کیا، ایوارڈ، انعامات کے ساتھ عوام وخواص عرب میں محبوبیت ونام وری اور عزت ووقار کے اعلا مقام پر فائز ہوئے، ان کے شاگرد دارالعلوم کے مدرسین اور فضلا نے بھی عربی زبان میں نصابی کتابیں اور دیگر مولفات رقم کیں، مولانا سید محمد رابع حسنی حال ناظم ندوۃ العلما نے منثورات، الادب العربی بین عرض و نقد، شعری انتخاب، الغزل الاردی، تاریخ ادب عربی حصہ دوم وغیرہ، سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلما مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کی عربی کتابیں و نگارشات بیش بہا عربی ادبیات کا سرمایہ ہیں، چند نام پیش ہیں: تعلم لغۃ القرآن، المذاہب المنحرفۃ فی التفسیر، دروس الاطفال، اساس اللغۃ العربیۃ کی تالیف کی نگرانی فرمائی، ان کے رفیق تدریس مولانا عبدالماجد ندوی نے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے اشتراک سے (معلم الانشا) کا چار حصوں میں مکمل سیٹ تیار کیا، مولانا محمد واضح رشید ندوی معتمد تعلیم ندوۃ العلما نے تاریخ ادب عربی اول، مناہج اللغۃ العربیۃ، حیاۃ السید احمد الشہید، مسحۃ ادبیۃ فی کتابات الشیخ ابی الحسن علی الندوی، ادب اہل القلوب

جیسی گراں قدر تصنیفات، مولانا سعید الرحمان اعظمی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلما نے علم التصریف، شعراء الرسول فی رحاب العارفین اور دیگر کتابوں کے علاوہ پچپن سال سے جاری (مجلۃ البعث الاسلامی) کی رہاست تحریر کی ذمہ داری کے ساتھ ہر ماہ اداریہ اور دارالعلوم ندوۃ العلما ہی کے صحیفہ (الرائد) میں کلمۃ الرائد کے عنوان سے لکھتے ہیں اور مولانا محمد واضح حسنی (البعث الاسلامی) کے شریک ادارت کے علاوہ (الرائد) کے رئیس تحریر بھی ہیں، مجلۃ (البعث الاسلامی) کے بانی اور اول رئیس تحریر عربی کے ممتاز ادیب و انشا پرداز صحافی و مفکر اور غیر معمولی عبقری شخصیت کے مالک مولانا سید محمد الحسنی تھے جو نوعمری میں اللہ کو پیارے ہوگئے، ندوۃ العلما کو جدید اسلوب، جدید مدارس عربی ادب سے تعارف اور زندہ و ترقی یافتہ، بلیغ و سلیس عربی کے رواج دینے میں اولیت حاصل ہے، دارالعلوم کے فضلا نے شگفتہ عربی میں (تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ و سوانح بھی لکھیں ہیں جن میں سے کئی کتابیں عرب پبلیشرز نے بھی شائع کی ہیں، تفسیر و حدیث میں مولانا سید سلمان حسینی نے کئی عربی کتابیں تحریر کیں، برجستہ وزود نویسی میں غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں، مولانا شفیق الرحمان ندوی نے الفقہ المیسر اور اساتذہ میں مولانا محمد اویس نگرامی نے تفسیر ابن قیم مرتب کی، راقم سطور نے عربی زبان میں شاہ ولی اللہ دہلوی، امیر سید صدیق حسن خاں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حیاۃ و آثار لکھی جو دار ابن کثیر دارالقلم دمشق سے شائع ہوئی، عربی سیکھنے کے لئے (المحادثۃ و التعبیر) مرتب کی، پروفیسر محسن عثمانی کی مرتبہ کتاب (یحدثونک عن ابی الحسن) دار ابن کثیر دمشق نے شائع کی، پروفیسر محسن عثمانی نے ''قضیۃ البعث الاسلامی'' کے عنوان سے اردو کتاب کا عربی میں ترجمہ کرکے قاہرہ (مصر) سے طبع کرائی، نیز مسعودی عالم شیخ محمد کتبی کے نعتیہ کلام کی تحقیق و ترتیب دے کر دہلی سے شائع کرائی، ڈاکٹر محمد اکرم ندوی نے (العلامۃ شبلی نعمانی) اور (العلامۃ سید سلیمان الندوی)، (الشیخ ابو الحسن علی الندوی) اور (الشیخ اشرف علی تھانوی) مولانا رحمت اللہ ندوی نے تحریر کی، مذکورہ کتابیں دارالقلم نے شائع کی ہیں، مولانا نذرالحفیظ ندوی عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ ندوۃ العلما نے (ابو الحسن علی الندوی ادیبا و کاتبا) لکھی، سید عبدالماجد غوری حیدرآبادی دار ابن کثیر دمشق سے (الشیخ ابو الحسن علی

حیاتہ و مؤلفاتہ) اور متعدد کتابوں کو عربی میں ترتیب دی اور حاشیے لکھ کر شائع کئے۔

فرزندان ندوۃ العلما نے عصر حاضر کی عربی زبان و اسلوب میں یہ خدمات پیش کر کے ہندوستان کے عربی مدارس و سرکاری یونی ورسٹیوں کے عربی شعبوں میں شوق و ذوق اور عزم و حوصلہ پیدا کردیا، دارالعلوم دیوبند میں مولانا ذوالفقار علی دیوبندی اور مولانا اعزاز علی نے عربی میں نثر و شعر کی جانب کچھ زیادہ توجہ دی تھی، بیسویں صدی عیسوی میں مولانا وحید الزماں کیرانوی نے درسی کتاب (القراءۃ الواضحۃ، تین حصوں میں) اور ڈکشنریاں تیار کر کے عربی طلبہ کے لئے آسانی فراہم کردی، ان کی آخری لغت کی کتاب (القاموس الوحیدی) ان کی وفات کے بعد ان کے برادر خورد مولانا عمید الزماں کیرانوی نے ایک عالمانہ پرمغز مقدمہ لکھ کر دو جلدوں میں شائع کیا، وہ خود بھی عربی کے ادیب و عالم ہیں، دیوبند ہی کے مولانا ندیم الواجدی نے عربی نصاب کی کئی کتابیں مرتب کی ہیں، مولانا عبدالحفیظ بلیاوی نے مصباح اللغات کے نام سے لغت تحریر کی، پروفیسر زبیر احمد فاروقی نے دارالعلوم دیوبند کی ادبی خدمات اور مولانا مفتی محمد عبداللہ اسعدی نے تاریخ دیوبند عربی زبان میں تصنیف کی۔

دوسرے مدارس مظاہر علوم سہارن پور، مدرسۃ الاصلاح، جامعۃ الفلاح، الجامعۃ السلفیۃ، الجامعۃ الاشرفیۃ اعظم گڈھ، دارالسلام عمرآباد، جامعہ اسلامیہ بھٹکل، جامعہ سبیل الرشاد بنگلور، الجامعۃ الندویۃ، جامعہ الفاروق کیرالا، الجامعۃ النظامیہ، دارالعلوم، سبیل السلام، المعہد العالی اور المعہد الاسلامی حیدرآباد اور جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڈھ علوم اسلامیہ کے پہلو بہ پہلو عربی زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کے لئے ترقی یافتہ نصاب اپنانے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، تاہم چند مدارس اب بھی قدیم نصاب ہی کو آسان و مثالی مانتے ہیں، ان تمام اداروں میں عربی کا اچھا ذوق اور عربی تحریر و تقریر پر دست گاہ حاصل کرنے کی سعی مشکور ہو رہی ہے، یہ مدارس عربیہ و اسلامیہ میں عربی زبان و ادب کے ارتقا و خدمات کا ایک سرسری جائزہ ہے، ہمارے ملک کی بیشتر سرکاری یونی ورسٹیوں (جو راس کماری سے کنیا کماری) تک خدمات انجام دے رہی ہیں، میں عربی شعبے قائم ہیں اور چند ایک میں شعبہ علوم اسلامیہ اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں شعبہ دینیات بھی ہے، جامعہ عثمانیہ میں بھی دینیات لازمی مضمون رہا ہے، یہ شعبے اس عصر جدید سے قبل عربی شعبے کہلاتے تو تھے مگر عربی زبان

دوسری زبانوں کے برعکس اپنے تشخص اور شناخت سے محروم تھی لیکن ربع صدی سے ان میں زندگی کی لہر دوڑ گئی اور عربی زبان ایک زندہ، متحرک اور فعال زبان کی شکل میں اپنا مقام حاصل کرنے لگی یا اچھا مقام بنالیا ہے، اب عربی زبان اپنے اصل مصادر و مراجع سے موضوعات مضامین اور عنوانات منتخب کررہی ہے، اگرچہ عربی ادبیات کے دینی و اسلامی علوم کے شعبے اب بھی توجہ کے مستحق ہیں اور نصاب طرز تعلیم و اسلوب بیان میں اصل مآخذ و مصادر سے براہ راست استفادہ کی صلاحیت پیدا کرنے اور عربی زبان پر قدرت و عبور کے بعد ارتقائی مراحل طے کئے جاسکتے ہیں، عربی زبان و ادب کے شعبے ادہر روایاتی موضوعات کے علاوہ یونی ورسٹی سمیناروں، تدریسی تربیتی کورس اور ورک شاپوں، نئے اور جدید رجحانات اور ادبی مدارس کی تخلیقات (جس میں عرب ممالک میں بہت کام ہوچکا ہے) سے متعلق سالانہ سمینار کررہے ہیں، خصوصیت سے مسلم یونی ورسٹی علی گڑہ میں (نثرعربی میں جدید رجحانات، شعر عربی میں نئے مکاتب و مدارس فکر، سیفل میں تینوں صدور شعبہ نے اپنے اپنے دور میں ان ممالک، خصوصاً خلیجی ممالک اور ان موضوعات پر سمینار منعقد کرائے جس سے ادبی انحراف اور خارجی اثرات کے زیر اثر ادبی سرمایہ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، مغربی (شمالی افریقہ) کے ادب، کویتی ادب، سعودی ادب نوبل انعام یافتہ مصری ادیب نجیب محفوظ کے افسانوں اور ناول و ڈراموں سے متعلق دو سال قبل اور ابھی گزشتہ ماہ سیفل کی جانب سے سلطنت عمان کے جدید ادب پر پروفیسر اقبال حسین کی سربراہی میں سمینار منعقد کیا گیا، خود اس شعبہ عربی جامعہ عثمانیہ نے کئی سمینار منعقد کئے جن میں افسانہ و ناول سے متعلق کامیاب سمینار منعقد کیا گیا، ان سمیناروں میں جو مقالات پیش کئے جاتے ہیں وہ ترتیب و مقدمہ کے ساتھ کتابی شکل میں شائع بھی ہورہے ہیں جن کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے، عربی زبان و ادب سے ذوق و شوق میں اضافہ ہونے کی وجہ سے کئی نئے جز وقتی نصاب بھی تیار کئے ہیں، پروفیشنل، ڈپلوما اور ایڈوانس ڈپلوما، ان خوش آیند رجحانات کی وجہ سے ہندوستان میں عربی سے متعلق تخلیقات، ترجمہ، صحافت میں خاصا کام ہورہا ہے۔

ہندوستان میں پہلا عربی اخبار (النفع العظیم لأهل هذا الاقليم) لاہور سے شیخ مقرب علی کی ادارت میں ۱۷؍اکتوبر ۱۸۷۱ء میں جاری ہوا، اس کے بعد مولانا عبداللہ عمادی نے مجلہ (البیان) اور مولانا ابوالکلام آزاد نے (الجامعة اور ثقافة الهند)، ندوۃ العلما لکھنؤ سے

(الضیاء) مولانا مسعود عالم اور ندوۃ العلما ہی سے (البعث الاسلامی اور الرائد) دیوبند سے (کفاح اور الداعی) اس کے عربی اخبار و جرائد شمال و جنوب سے کیرالا میں الاصلاح، الثقافة، الجامعة، خود حیدرآباد سے دارالعلوم حیدرآباد سے مولانا محمد نعمان الدین ندوی کے زیر ادارت (الصحوة الاسلامیه) سہ ماہی اور سیفل کے استاذ ڈاکٹر سید جہاں گیر کی ادارت میں پندرہ روزہ (حراء) نکلتا ہے۔

ان عربی خدمات کی تفصیلات شعبہ عربی جامعہ عثمانیہ کے سابق فاضل استاذ پروفیسر محمد سلطان محی الدین کی کتاب (علماء العربیة و مساهماتهم فی الأدب العربی) پروفیسر ویران محی الدین کی کتاب (الشعر العربی فی کیرالا) پروفیسر اے احمد کٹی کی عربی ادب سے متعلق کتاب اور عربی مقالات اور مدراس سے مولانا یوسف کوکن کی مدراس و کرناٹک میں عربی زبان و ادب کے ارتقا سے متعلق قابل قدر نگارشات ہیں، مدارس و یونی ورسٹیوں کے کئی اساتذہ ایسے ہیں جنھوں نے اپنی عربی تصنیفات و تحقیقات سے عالمی شہرت حاصل کی، مولانا عبدالعزیز میمنی راج کوٹی نے ابو العلاء المعری اور سمط اللآلی وغیرہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین اور النبوة والانبیاء، رجال الفکر والدعوة اور روائع اقبال والسیرة النبویة سے، ڈاکٹر حمید اللہ نے الوثائق النبویة، السیرة النبویة، ڈاکٹر عبدالمعید خاں، پروفیسر مختار الدین احمد اپنی تحقیقی خدمات کی وجہ سے عرب ممالک میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے، ان کے علاوہ کئی ایسی شخصیتیں ہیں جنھیں اس مختصر مقالہ میں شامل کرنا ممکن نہیں ہے۔

اولئک آبائی فجئنی بمثلهم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

ہم ذکر کرچکے ہیں کہ عربی ادبیات ہندوستان میں دینی مزاج و رجحان سے ہمیشہ آراستہ رہی، ادب نے جب بے ادبی اور غیر انسانی و غیر اخلاقی روش اختیار کی اور ادب کا پاکیزہ و شفاف مفہوم مجروح ہونے لگا تو ہندوستان ہی سے ایک نئی ادبی تحریک کی تجویز پیش کی گئی اور جس شخصیت نے پیش روی و رہنمائی کی وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم عرب و اسلام کی معتبر و باوقار علمی و ادبی

شخصیت تھی، ۱۹۵۷ء میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو عربی دنیا کی سب سے قدیم اکیڈمی (المجمع العلمی العربی) اب (مجمع اللغة العربیة) دمشق نے اپنا رکن بنایا تو مولانا رحمہ اللہ نے اس رسالہ المجمع العلمی العربی کے لئے ایک طویل مضمون لکھا، اس سے قبل مختارات اور القراءة الراشدہ کے مقدموں میں اشارہ کر چکے تھے کہ اس وقت عالم عرب و اسلام کو (اسلامی ادب) کی ضرورت ہے جو ادبی تحریکوں کو درست، متوازن، انسان نواز اور مردم گر رخ دے سکتا ہے، مولانا رحمہ اللہ نے پورے عربی ادبیات کا عالمانہ و ادیبانہ معروضی جائزہ لینے کے بعد لکھا: "اس کے بعد ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم عربی کتب خانہ کا از سرنو جائزہ لیں اور اپنے نوجوانوں اور نئی نسل کے سامنے قدیم عربی کتابوں کے شہ پارے اور تعمیری نگارشات پیش کریں جس سے وہ اس زبان کی شیرینی، چاشنی، بلاغت، سلاست اور حسن تعبیر کا لطف لے سکیں اور ادب کے اصل روح و تعمیری رجحانات کی بازیافت کر سکیں"۔ (۹)

مولانا علی میاں رحمہ اللہ کی یہ آواز صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوئی اور ۱۹۸۱ء میں عرب ادیبوں کی ایک عالمی کانفرنس نے (عالمی رابطہ ادب اسلامی) کے قیام پر اتفاق کر لیا، مولانا رحمہ اللہ اس کے پہلے صدر منتخب کئے گئے اور اس کا مرکزی دفتر ندوۃ العلما لکھنؤ میں قائم کیا اور سعودی عرب، مراقش، مغربی و عرب ممالک اور جنوبی مشرقی ایشیا میں شاخوں کی تشکیل شروع کر دی گئی، مولانا رحمہ اللہ کی وفات کے بعد مدینہ منورہ میں رابطہ ادب اسلامی کی مجلس عاملہ نے پروفیسر عبدالقدوس ابو صالح کو صدر منتخب کیا اور ان کے دو نائب صدر مولانا سید محمد رابع حسنی نائب صدر اول اور ڈاکٹر عبدالباسط بدر نائب صدر ثانی منتخب کئے گئے، چوں کہ ڈاکٹر عبدالقدوس کا قیام ریاض سعودی عرب میں ہے، اس لئے مرکزی دفتر وہاں منتقل ہو گیا ہے، ندوۃ العلما کا دفتر برصغیر اور جنوب مشرقی ایشیا سے متعلق باقی ہے، ہندوستان کا دفتر دہلی میں ہے، یہ راقم سطور اس کا ذمہ دار ہے، ہند کے دوسرے شہروں میں اس کے علاقائی و شہری دفاتر ہیں، حیدرآباد میں بھی اس کی شاخ ہے اور اس کے ذمہ دار ڈاکٹر راشد نسیم ہیں، دو سال قبل خواتین ادبیات کا شعبہ قائم ہو گیا ہے، حیدرآباد میں اس کی ذمہ دار پروفیسر قمر النسا اور ڈاکٹر مہ جبیں ہیں جن میں سے اول الذکر نے ایک ہندوستانی اسلامی ادیب علامہ فضل حق پر تحقیقی کتاب لکھی ہے اور دوسری خاتون نے مصر کے اسلامی ادیبوں

کے پیش رو مفتی محمد عبدہ کی ادبی خدمات پر ریسرچ کی ہے۔

عالمی ادب اسلامی نے اب تک سو سے زیادہ کتابیں مختلف زبانوں میں شائع کی ہیں، تین جلدوں میں اسلامی ادیبوں کی ڈکشنری مرتب کی ہے، مرکزی دفتر ریاض سے (مجلة الادب الاسلامی) کے نام سے تحقیقی و ادبی رسالہ نکلتا ہے، مراقش سے مشکوٰۃ کے نام سے، ترکی سے ادبی کارواں، لکھنؤ سے کاروان ادب، پاکستان سے قافلة الادب الاسلامی اور بنگلہ دیش سے بھی ایک رسالہ پابندی سے نکل رہا ہے۔

ہمیں حیدرآباد کی ادبی خدمات پر مزید روشنی ڈالنی تھی لیکن مقالہ اور وقت کی تنگ دامانی اجازت نہیں دے رہی ہے، اس شعبہ عربی کے اساتذہ اور سربراہوں میں بہت اہم ادبا و اہل قلم گزرے ہیں، ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے دائرۃ المعارف العثمانیہ کی اس فہرست کی افادیت کو سلام کرتا ہوں جس کے مرتب مولانا محمد عمران اعظمی عمری ہیں جو عالم بھی ہیں، محقق بھی ہیں اور ادیب و شاعر بھی، عربی میں بھی شعر کہتے ہوں گے۔

ہم نے عربی ادبیات کے قدیم و جدید رنگارنگ چمن میں چند خوش گوار لمحے گزارے، یہ علما، ادیبوں اور شاعروں کا ایک حسین گلدستہ ہے جس میں ہند کے مشرق و مغرب اور جنوب و شمال کے خوش رنگ اور عطر بیز و مشک بار گل و نسترن جمع ہو گئے ہیں جن سے آئندہ نسلیں اپنے صحن چمن اور دامن دل کو آباد رکھیں گی، یہی ان پاکیزہ نفوس قدسیہ کی گراں مایہ مقدس امانت و ورثہ ہے۔

کیا لوگ تھے جو راہ وفا میں گزر گئے
جی چاہتا ہے نقش قدم چومتے چلیں

حوالے

(۱) راقم سطور کی عربی کتاب (الامیر سید صدیق حسن خاں، حیاتہ و آثارہ) ص ۲۹۴ اور ۸۷، ۸۶۔ (۲) اعیان طلیسا۔ (۳) تمہید ص ا۔ (۴) تاریخ ندوۃ العلما، ص ۹۶۔ (۵) ایضاً ص ۳۳، ۱۱۲۔ (۶) ایضاً ص ۷۲۔ (۷) ایضاً ص ۶۲، بحوالہ پروفیسر محمد اقبال حسین صاحب کی کتاب (افکار) ص ۲۶، ۲۵۔ (۸) ایضاً ص ۷۳۔ (۹) افکار ص ۱۲۔ (۱۰) مقدمہ مختارات من ادب العرب۔

"جاوید نامہ" ایک پیغام عمل

از:- ڈاکٹر شاہد نوخیز☆

شاعر مشرق علامہ اقبال کی شاعری خودی، عشق، زندگی، ارتقا اور جد و جہد کی شاعری ہے، ان کے نزدیک زندگی کا سفر ایک انقلابی و اختراعی عمل ہے، جو شوق نمو اور جوش ارتقا سے سرشار ہے، ان کے فلسفہ خودی میں نہ صرف اسلامی افکار و عقائد کی روح نظر آتی ہے بلکہ اس میں سوز عشق یقین و ایمان، جرأت و قوت اور حریت فکر کی ایک تابناک شمع روشن دکھائی دیتی ہے، اقبال نے اس فلسفۂ حیات سے اپنی افسردہ اور شکست خوردہ ملت کو ایک نئی زندگی کا پیغام دیا جو حرف و صورت اور تخیل و نغمہ کے دل آویز قالب میں ڈھلا ہوا تھا، جس کے ذریعہ انہوں نے قوم کی دوبارہ شیرازہ بندی کی کوشش کی، اسرار خودی، رموز بے خودی، پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق اور ارمغان حجاز کے ذریعہ انہوں نے ایک نظام زیست اور رازدروں کی تشریح کی کوشش کی، اسرار خودی میں خودی کی ماہیت و اہمیت، پرورش و تربیت اور اس کے مراحل و مدارج پر نہ صرف سیر حاصل بحث ہے، بلکہ یہ بھی اجاگر کیا ہے کہ خودی سے کس طرح انسان مجبوری سے مختاری کی طرف گام زن ہوتا ہے اور رموز بے خودی میں یہی خودی اجتماعی شکل اختیار کر گئی ہے جو فرد سے اوپر اٹھ کر جماعت اور زندگی کی ترجمانی کرتی ہے جب کہ پیام مشرق اور زبور عجم میں عشق، تصوف اور فلسفہ بھی زندگی کو قوت اور تقویت عطا کرتے نظر آ رہے ہیں اور یہی قوت خاکی کو عرشی پر فوقیت دیتی ہے، اقبال نے زندگی کو خلاق اور مشتاق کے نام سے یاد کیا ہے، لذت تخلیق خودی کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور تخلیق کے عمل سے انسان کے اندر خدائی صفات پیدا ہوتی ہیں، ذوق اور شوق طلب سے انسان کے اندر وہ قوت ابھرتی ہے، جس سے وہ آفاق پر غالب آتا ہے:

زندہ ای مشتاق شو خلاق شو   ہمچو ما گیرندۂ آفاق شو

☆ صدر شعبہ فارسی شبلی نیشنل کالج، اعظم گڈھ۔

خودی ہی کی طرح عشق بھی اقبال کا محبوب ترین موضوع ہے جو صوفیانہ شاعری کی بنیاد بھی ہے، صوفی شعرا سے قبل عشق کا لفظ عربی و فارسی شاعری اور قرآن و حدیث میں کم استعمال ہوا ہے، اس پر سب سے پہلا اور جامع مضمون رسائل اخوان الصفا میں ملتا ہے، شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی نے حکمت الاشراق میں لکھا کہ:

"ہر بلند نور کو نیچے کے نور پر غلبہ حاصل ہے اور نیچے کا نور بلند نور سے محبت رکھتا ہے اور اسی قہر و مہر سے نظام عالم کا وجود وابستہ ہے اور جب بہت سے انوار جمع ہو جاتے ہیں تو بلند نور نیچے کے نور پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور نیچے کے نور کو بلند نور کا شوق اور عشق ہو جاتا ہے"۔

اقبال کے نزدیک عشق زندگی کا وہ جذبہ ہے جس کی بہ دولت کلیاں کھلتی ہیں، غنچے ہنستے ہیں، ستاروں کا کارواں رواں دواں ہے، تہذیبیں وجود میں آتی ہیں، قافلۂ ہستی نئی منزلوں کی تلاش میں آگے بڑھتا ہے، زندگی خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں ہے اور پوری کائنات زندگی کی ہنگامہ آرائیوں سے گونج اٹھتی ہے، عشق نے ہی عالم رنگ و بو میں ہماہمی، جوش و مستی اور شوق و اشتیاق کو جنم دیا، یہ جذبہ لازماں و لامکاں ہے اور اس کے بغیر کائنات کی حیثیت ایک بزم خموشاں کی ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال عشق کو سلطان کے نام سے یاد کرتے ہیں اور پوری کائنات کو اس کے زیر نگیں پاتے ہیں:

عشق سلطان است و برہان مبین   ہر دو عالم عشق را زیر نگیں

لا زماں و دوش و فرد ای ازو   لا مکاں و زیر و بالائے ازو

"جاوید نامہ" بھی اسی قوت تسخیر اور آئین زندگی کی ایک مضبوط ترین کڑی ہے، جس کو شاعر مشرق نے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا جس میں اقبال نے سیر افلاک کے ذریعہ ڈرامائی اور دل چسپ انداز میں اپنا فلسفہ حیات اور اسلامی افکار و عقائد کو پیش کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے، "جاوید نامہ" اس نوعیت کی پہلی تصنیف نہیں بلکہ زمانہ قدیم میں بھی اس موضوع پر متعدد کتب موجود تھیں جس نے اقبال کی تمثیلی و تخیلی پرواز میں اضافہ کیا، اس نوعیت کی سب سے پہلی تصنیف پہلوی زبان میں ساسانی سلطنت کے بانی اردشیر کی اردویراف نامہ ہے جو کہ تیسری صدی عیسوی میں تحریر ہوئی، عربی ادب میں اس نوعیت کی اہم تصنیف ابوالعلامعری کا رسالہ "الغفران" ہے، اسلامی کلاسیکی ادب میں اس قسم کی سب سے معروف کتاب شیخ محی الدین ابن عربی کی "الفتوحات المکیہ"

ہے، فارسی ادب میں اس موضوع پر سنائی کی ''سیر العباد الی المعاد'' ہے، مغربی ادب میں اس موضوع پر سب سے اہم اور مشہور ترین تصنیف دانتے کی ''طربیہ الٰہی Devine Comedy'' ہے، سیر السما بھی اسی نوعیت کی ایک کتاب ہے جس کو شاہ محمد غوث گوالیاری نے تصنیف کیا تھا، یہ تمام کتابیں اقبال کے تخیل کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئیں جس سے جاوید نامہ جاوداں ہوا۔

''جاوید نامہ'' کا آغاز مناجات سے ہوتا ہے جس کے بعد شاعر اپنی بے چارگی، بے بسی، کوتاہ نظری اور مجبوری کا ذکر کرتا ہے کہ کائنات میں کوئی بھی اس کا ہم نوا نہیں ملتا جب کہ وہ اس فضائے نیلگوں میں سکوت و جمود کو توڑ کر لامتناہی وسعتوں کو دیکھنا چاہتا ہے لیکن وہ تنگ آکر کہتا ہے کہ:

این جہاں صید است و صیادیم ما　　یا اسیر رفتہ از یادیم ما

لیکن جلد ہی اسے فرزند آدم کا احساس ہوتا ہے کہ یہ جہان رنگ و بو اور یہ فرش و عرش سب کے سب اس کے زیر نگیں ہیں اور یہ خاکی راز دار عَلَّمَ الْاَسْمَاءَ و زمین دار کائنات ہے، مناجات کے بعد تمہید شروع ہوتی ہے جس میں تخلیق کائنات کے پہلے دن انسانی عظمت کا اعتراف آسمان کی زبان سے ہوتا ہے، پھر زمین کی تعریف بیان ہوتی ہے، اس طرح آسمان اور عرشیوں نے خاک اور خاکیوں کی تعریف کی، جن سے عظمت آدم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، تمہید اس شعر پر اختتام پذیر ہوتی ہے:

ہر کہ عاشق شد جمال ذات را　　اوست سید جملہ موجودات را

تمہید کے بعد فرشتوں کا نغمہ شروع ہوتا ہے جس طرح آسمان نے زمین کی تعریف کی، اسی طرح عرش کے رہنے والوں نے فرش کے رہنے والوں کی تعریف کی، شاعر ان ہی تعریف و تمہید حالات و کیفیات میں گرفتار ہے اور اسے کوئی محرم راز نہیں ملتا ہے: اقبال اپنی یادوں میں گم تنہا سمندر کے کنارے کھڑے ہیں، شام کی آمد آمد ہے اور آفتاب غروب ہوتے ہی منظر عجیب و غریب کیفیت اختیار کر لیتا ہے اور اسی کیفیت میں پہاڑ کی اس جانب سے روح رومی پردوں کو چاک کرتی ہوئی نمودار ہوتی ہے، اس کا پیکر نور سرمدی سے روشن اور چہرے پر آفتاب کی درخشانی ہے، شاعر اور رومی میں طویل مکالمہ شروع ہوتا ہے، شاعر کی ہر بات کا جواب رومی نہایت بلیغ اور دل نشیں انداز میں دیتے ہیں، فلسفہ، جبر و قدر، عشق و عقل، خلوت و جلوت اور فلسفہ معراج پر تسلی بخش جواب کے بعد انسان کی عظمت اور قوت کا اعتراف خود رومی دل کش انداز میں کرتے ہیں، جو شاعر میں انقلاب برپا کر دیتا

ہے، اسی دوران ایک فرشتہ نمودار ہوتا ہے جس کے چہرے کے دو رخ ہیں، ایک طرف شہاب ثاقب کی تابانی ہے تو دوسری طرف شب تاریک کی ظلمت، اس کی رفتار تیز تر ہے، وہ شاعر سے کہتا ہے کہ میرا نام زروان ہے، میں ظاہر بھی ہوں اور پنہاں بھی، موت و زندگی، حشر و نشر اور بہشت و جہنم میری ہی ذات سے عبارت ہیں، اس نے کہا کہ جس کا دل لی مع اللہ سے سرشار ہے وہ میرا طلسم توڑ سکتا ہے، اگر تو چاہتا ہے کہ میں درمیان سے ہٹ جاؤں تو ان الفاظ کا ورد کر، شاعر کہتا ہے کہ نہ جانے اس کی نگاہوں میں کیا تھا کہ اس نے یہ دنیا میری نگاہوں سے اوجھل کر دی اور میں ایک نئی دنیا میں عجیب و غریب کیفیت اور نئی تاب و توانائی کے ساتھ جا پہنچا جو کہ بالکل جدا جگہ اور زمین ہی نہیں بلکہ الگ سیارہ بھی تھا، جہاں شاعر کو ستاروں کا نغمہ سنائی دے رہا تھا، گویا ستارے شاعر کا استقبال کر رہے تھے، اقبال ان نغموں کو زمزمہ انجم کے نام سے یاد کرتے ہیں جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

عقل تو حاصل حیات، عشق تو سر کائنات　　پیکر خاک خوش بیا این سوئے عالم جہات

اس کے بعد ستارے شاعر کو فقر کی تندی و تیزی کا احساس دلاتے ہیں جس کے سامنے میری و قیصری بے وقعت ہے، دبدبہ قلندری اور طنطنہ سکندری کا مقابلہ کرنے کے بعد ستارے شاعر سے خواہش کرتے ہیں کہ:

ضرب قلندری بیار، سد سکندری شکن　　رسم کلیم تازہ کن، رونق ساحری شکن

کتاب کا ابتدائیہ یہاں ختم ہوتا ہے اور کتاب کے آغاز میں اقبال فضائے نیلگوں کی سیر اپنے امام رومی کی رہنمائی میں شروع کرتے ہیں اور سب سے پہلے فلک قمر پر پہنچتے ہیں، ستارے شاعر کے ہم سفر ہوتے ہیں، فلک قمر کے بعد فلک عطارد، فلک زہرہ، فلک مریخ، فلک زحل کی جانب گام زن ہوتے ہیں اور ہر ایک کا بیان انتہائی حیرت انگیز اور عبرت آمیز انداز میں کرتے ہیں اور مجاہدین سلاطین مبلغین کے ساتھ ساتھ ادبا، شعرا، فضلا اور فلاسفہ کی زبانوں سے پیغام عمل کا دریا رواں ہوتا ہے، فلک قمر کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ یہ جگہ دو پہاڑوں کے درمیان ہے، ان پہاڑوں کو اقبال خافطین اور یلدرم کے نام سے یاد کرتے ہیں، ان پہاڑوں پر سکوت و جمود کی حکم رانی ہے اور صرف دھواں ہی دھواں دکھائی دیتا ہے، یہ زمین شادابی و سرسبزی سے نا آشنا ہے اور یہاں زندگی کے کوئی آثار نہیں ملتے اور نہ ہی یہاں انقلاب و حادثات نے جنم لیا، اقبال رومی کی رہنمائی میں ایک غار تک پہنچتے ہیں، وہاں ان کی ملاقات ایک عارف ہندی سے ہوتی ہے جس کا نام ''جہاں دوست'' ہے،

یہ مرد عارف آب وگل سے بالاتر ہے، عارف ہندی رومی سے پوچھتا ہے تیرا ساتھی کون ہے؟ مجھے اس کی آنکھوں میں آرزوئے زندگی دکھائی دیتی ہے، رومی اقبال کا تعارف یوں کراتے ہیں:

مردے اندر جستجو آوارۂ ثابتے با فطرت سیارۂ
پختہ تر کارش زخامی ہائے او من شہید ناتمامی ہائے او

اس کے بعد جہاں دوست اور رومی میں عالم، آدم، حق، زندگی، خودی، خدا، گل وگل اور زمین وآسمان کے علاوہ مختلف مذاہب اور ان کے بانیوں کے بارے میں طویل فلسفیانہ گفتگو ہوتی ہے، جن میں بیشتر مذاہب، ان کے ادوار واطوار اور عروج وزوال پر سیر حاصل بحث ہوتی ہے، پھر انتہائی ادب واحترام کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا ذکر ہوتا ہے، اسلام کے ہمہ گیر نظریات ومساوات، نفس سے جہاد اور اخوت ومحبت کو نوحہ روح ابوجہل در حرم کعبہ کے تحت بیان کیا ہے، جس میں اسلام کی کامیابی وکامرانی پر ابوجہل کی روح نوحہ کناں ہے، اسی پر قمر کی سیر ختم ہوتی ہے:

مرد مومن زندہ و با خود بجنگ برخود افتد ہمچو بر آہو پلنگ

شاعر کی اگلی منزل فلک عطارد ہے، یہاں بھی زندگی کے کوئی آثار نہیں لیکن شاعر کو اچانک اذان کی آواز سنائی دیتی ہے، رومی شاعر کو بتاتے ہیں کہ یہ مقام اولیا ہے اور یہاں اہل عرفان و حقیقت کا گزر ہوتا ہے، شاعر اور رومی محو گفتگو بھی ہیں اور محو سفر بھی، اقبال دیکھتے ہیں کہ دو آدمی نماز میں مصروف ہیں جس میں ایک سید جمال الدین افغانی اور دوسرے سعید حلیم پاشا ہیں، نماز کے بعد رومی دونوں سے شاعر کا تعارف کراتے ہیں، اس کے بعد گفتگو شروع ہوتی ہے جس میں ملک، ملت، سیاست، اشتراکیت، ملوکیت اور عظمت آدم کے موضوعات زیر بحث آتے ہیں جس میں ”حکمت کثیر است“ کے عنوان سے شاعر نے علم کی زبردست اہمیت پر روشنی ڈالی ہے کہ علم سے انسان دوگیتی سے آشنا ہی نہیں ہوتا بلکہ حکم راں ہوتا ہے لیکن علم کے دو رخ ہیں، اگر یہ حق سے وابستہ ہو تو اس کو پیغمبری کا مقام حاصل ہوتا ہے اور اگر حق سے غافل ہو تو علم محض کافری ہے اور مغرب اسی کا شکار ہے، اقبال حق گریز ملا پر تنقید کرتے ہوئے اسے قرآن فروش، کم نگاہ، کور ذوق اور زہرہ گو کہہ کر اس کا موازنہ کافر سے اس طرح کرتے ہیں:

دین کافر فکر و تدبیر جہاد دین ملا فی سبیل اللہ فساد

اس کے بعد اسلام اور قرآن کی اوصاف گردانی کرتے ہوئے، اسے سرمایہ رشد و

ہدایت نہیں بلکہ ملوکیت، مغربیت اور سرمایہ داری کے لئے پیغام موت بھی قرار دیتے ہیں۔

فلک عطارد کے بعد فلک زہرہ کا سفر شروع ہوتا ہے، شاعر رومی کے ساتھ ایک تاریک سمندر کو عبور کر کے ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں بہار اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے، ہر طرف دل کشی ودل کشائی کا منظر ہے، یہ قدیم خداؤں کا مسکن ہے، جہاں طرح طرح کے دیوتا براجمان ہیں اور اس دور بے خلیل پر مسرت وکامرانی کا اظہار کر رہے ہیں، چراغ مصطفوی کو بجھانے، وطنیت، نسب پرستی اور تعصبات کو پھیلانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں، فلک زہرہ پر ہی پہاڑ کے اس جانب سمندر میں شاعر نے فرعون اور لارڈ کچز کو ڈوبا ہوا دیکھا، رومی شاعر کو بتاتے ہیں کہ یہ مغرور سرکش لوگوں کا مقام ہے، اس میں سے ایک چوب حکیم کا زخم خوردہ ہے تو دوسرا تیغ درویش کا کشتہ ہے، یہاں درویش سے مراد مجاہد مہدی سوڈانی ہیں جنہوں نے سوڈان میں برطانوی استعمار کو شکست دی تھی اور ان کی وفات کے کئی سال بعد لارڈ کچز نے ان کی ہڈیوں کو قبر سے نکلوا کر بے حرمتی کی تھی، کچز کا بحری جہاز جنگ عظیم میں ایک جرمن آب دوز کشتی کا نشانہ بنا تھا، یہاں مہدی سوڈانی کی روح کچز سے یوں ہم کلام ہوتی ہے:

گفت اے کشز اگر داری نظر انتقام خاک درویشی نگر
آسماں خاک ترا گوری نداد مرقدی جز دریم شوری نداد

آخر میں اقبال نے عرب کو بار بار اس کی عظمت دیرینہ یاد دلا کر للکارا ہے، تا کہ اس کا خوابیدہ ذہن بیدار ہو اور وہ جہاں کی معماری کے لئے کمربستہ ہو جائے:

گفت اے روح عرب بیدار شو چون نیا گاں خالق اعصار شو
زندہ کن در سینہ آں سوزی کہ رفت در جہاں باز آور آں روزی کہ رفت

شاعر کی اگلی منزل فلک مریخ ہے، یہ جگہ ہمارے کرۂ ارض کی طرح عالم رنگ وبو ہے اور اس میں دنیا کی تمام تر رونقیں پائی جاتی ہیں، مریخ کے شہر و دیار اور کاخ وکوہ کی سیر کے بعد شاعر کی ملاقات ایک مفکر سے ہوتی ہے جو فلسفہ تقدیر اور جبر وقدر کے ساتھ ساتھ زندگی، قدرت، مذہب، فطرت، معاشی بحران وکثرت پر وضاحت سے روشنی ڈالتا ہے، اس کے بعد شاعر، رومی اور مفکر ایک میدان کی جانب بڑھتے ہیں، وہاں شاعر ایک دوشیزہ کو دیکھتا ہے جس نے پیغمبری کا دعوا کیا ہے اور ایک بھیڑ اس کے ارد گرد جمع ہے، شاعر مشرق نے اس دوشیزہ کی تقریر کی آڑ میں

مغربی عورتوں کے کردار پر چوٹ کی ہے، اس کے بعد رومی دین، ملت، وطن اور عشق پر تفصیل سے بحث کرتے ہیں اور اپنا فلسفہ حیات پیش کرتے ہیں، اس بحث پر یہ منزل ختم ہوتی ہے۔

اس کے بعد شاعر رومی کے ہم راہ فلک مشتری پر پہنچتا ہے، اس مقام سے ستارے بالکل قریب تر ہیں اور چاند مسلسل اس کا طواف کرتا ہے، اس پر کیف منظر کا شکوہ شاعر کو اپنے حال سے بے خبر کر دیتا ہے، اسی وقت شاعر تین پاک باز روحوں کو دیکھتا ہے، ان کے جسم پر لالہ گوں لباس ہے اور ان کے چہرے سوز دروں سے تمتما رہے تھے، رومی شاعر سے کہتے ہیں کہ اگر تو نے شوق بے پروا کو نہیں دیکھا ہے تو ان کا نظارہ کر اور ان کی آتش نوائی سے زندگی حاصل کر، یہ تینوں روحیں غالب، منصور اور طاہرہ کی تھیں جنہوں نے بہشت میں جانے سے انکار کر دیا تھا اور بہشت پر گردش دوراں کو ترجیح دی تھی، غالب اور طاہرہ شاعر سے اپنے کلام کے ذریعہ مخاطب ہوتی ہیں، غالب نے جو غزل سنائی تھی اس کا مطلع و مقطع یوں تھا:

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم   قضا بگردش رطلِ گراں بگردانیم
ز حیدریم من و تو ز ما عجب نبود   گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

طاہرہ بھی سوز و مستی اور ذوق و شوق میں ڈوبی ہوئی ایک غزل سناتی ہیں جو اس طرح ہے:

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو برو   شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو
از پئے دیدن رخت ہمچو صبا فتادہ ام   خانہ بخانہ در بدر کوچہ بہ کوچہ کو بکو
در دلِ خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا   صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا پردہ بہ پردہ تو بہ تو

یہ شور و سوز، گداز و مستی، قوت جبروت اور یقین محکم شاعر کے افکار میں طوفان برپا کر دیتا ہے، جس کے بعد منصور سے طویل مکالمات کا آغاز ہوتا ہے، خیر و شر، علم و عشق، جبر و قدر، خدا اور رسول، مشاہدہ و دیدار، فنا و بقا اور ابلیس و انسان کے موضوعات پر صرف بحث ہی نہیں بلکہ فکر و نظر کا اظہار بھی ہوتا ہے، مثلاً علم و عشق کے بارے میں منصور کہتا ہے کہ علم کی بنیاد امید و بیم پر ہے اور عشق دونوں سے ماوراء، علم جلال کائنات سے خوف زدہ تو عشق جمال کائنات میں گم، علم کی نظر گزشتہ اور حال پر ہے تو عشق کی نظر آئندہ و تابندہ پر، علم آئین جبر کا پابند ہے تو عشق عالم وجود کا بے باک تماشائی، اسی طرح کی سوچ ایرانی شاعرہ طاہرہ کی بھی تھی، اس کا عقیدہ تھا کہ صاحب جنوں کا گناہ نئی دنیاؤں کی تخلیق کرتا ہے، شوق بعید پردوں کو چاک کر دیتا ہے اور لذت تازہ کاری

سے طرز کہن کا خاتمہ ہوتا ہے، جب کہ مرزا غالب سوز جگر، اس کی آفاق گیر صلاحیت، ہنگامہ عالم اور تقدیر و ہدایت کی بات کرتے ہیں، تب و تاب، شوق دیدار اور ذوق پرواز کے اسی درس پر ملاقات ختم ہوتی ہے، فضا تاریک ہوتی ہے اور رات کے اندھیرے میں ایک شعلہ سا لپکتا ہے، یہ ابلیس کی آمد آمد ہے، جس کو رومی نے خواجہ اہل فراق کے نام سے یاد کیا ہے اور سراپا سوز کہا، وہ شاعر سے اپنا تعارف کراتا ہے، ابلیس انکار کی وجہ بتاتا ہے کہ اس نے آدم کی شخصیت کی تکمیل اور اس کے ذوق اختیار کے امتحان کے لئے یہ قربانی دی اور انتہائی برا کردار اختیار کیا، ابلیس کہتا ہے کہ سوز فراق ہی زندگی کا نغمہ ہے اور وصل کا تصور ہی تباہی کا باعث، وہ درد فراق کی سرمستی پر ناز و مسرت کرتا ہے، اس کے بعد ابلیس خدا سے شکایت کرتا ہے کہ اس کا شاہکار پست ہمت، بے بس، مجبور، لاچار، کم زور اور کور نظر ہے اور میں انسان کی فرماں پذیری سے تنگ آگیا ہوں، میں صاحب نظر کی تلاش میں ہوں، ایک پختہ تر حریف سے مقابلہ چاہتا ہوں، اے خدا! مجھے ایسے بندۂ حق پرست کی جستجو ہے جو مجھے شکست کی لذت چکھا سکتا ہو، تاکہ میری تاب و طاقت میں مزید اضافہ ہو، یہ سفر اسی نالہ پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

فلک مشتری کے بعد شاعر رومی کی قیادت میں فلک زحل پر پہنچتا ہے، یہ مقام پچھلے تمام مقامات سے جدا ہے، رومی اس کو مطرود و مردود سپہر کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس مقام پر روشنی کا نام و نشان نہیں، صرف تاریکی ہی تاریکی اور حیرت و وحشت کی جگہ ہے، ایک لاکھ فرشتے مسلسل اس پر بجلی کے کوڑے برسا رہے ہیں اور یوں قہر الٰہی کے اظہار میں پیہم مصروف ہیں، یہاں ارواح رذیلہ کا بسیرا ہوتا ہے، جہاں ملک و ملت کے غدار اپنے جرم کی سزا کاٹ رہے ہیں جنہیں جہنم نے بھی ٹھکرا دیا ہے:

جعفر از بنگال و صادق از دکن   ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن

شاعر نے ان غداروں کو انتہائی ذلیل حالت و حرکت میں دیکھا، جہنم نے بھی ان سے پناہ مانگی، یہ دونوں ارواح خبیثہ در بدر کی ٹھوکر کھا رہی ہیں اور فریاد کرتی ہیں کہ ہمیں نہ عدم نے قبول کیا اور نہ وجود نے، ہم دوزخ کے دروازے پر بھی گئے مگر اس نے بھی ہم پر چنگاری نہ برسائی اور کہنے لگی کہ دوزخ اس خس و خاشاک سے پاک رہنا چاہتی ہے، ہم آسمان کے اس طرف مرگ ناگہاں کے پاس پہنچے تو اس نے بھی یہ کہہ دیا کہ غدار کی جان کو موت کی آسودگی میسر نہیں ہو سکتی اور جب ہم کوئی فریاد کرتے ہیں تو ایک صدائے ہولناک بلند ہوتی جس سے سمندر کا

سینہ چاک چاک ہو جاتا ہے، پہاڑ ہوا میں اُڑ اُڑ کر ٹکرانے لگتے ہیں، موجوں کے شور اور گرج میں اضافہ ہو جاتا ہے، پہاڑ اور وادی و دشت طوفان خیز سمندر کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، گویا یہی غداروں کی فریاد کا جواب یا مدد ہے جو ان کی تکالیف میں مزید اضافہ کر دیتے ہیں:

ملتے را ہر کجا غارت گرے است　　　اصل او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از روح جعفر الاماں　　　الاماں از جعفرانِ ایں زماں

شاعر انہیں دیکھتا ہوا ستاروں کے ہم راہ آگے بڑھ جاتا ہے اور افلاک کا یہ سفر زحل پر ختم ہو جاتا ہے، اب شاعر رومی کی سرپرستی میں دوسرے جہاں کی طرف بڑھتا ہے، وہاں کی سرحد پر ایک شخص کو دیکھتا ہے جو بار بار یہ شعر پڑھ رہا ہے:

نہ جبریلی نہ فردوسی، نہ حوری، نہ خداوندی　　　کف خاکی کہ می سوزد ز جانِ آرزومندی

اس شخص کی آنکھیں عقاب سے تیز اور اس کے رخ پر سوز جگر کی تاب و توانائی ہے، شاعر رومی سے پوچھتا ہے کہ یہ دیوانہ کون ہے؟ رومی شاعر کو بتاتے ہیں کہ یہ جرمن کا فلسفی نیتشے ہے اور اس کا مقام ان دونوں جہاں کے درمیان ہے، کیوں کہ اس کے فلسفے نے اس کو پرواز تو دی لیکن منزل نہیں کیوں کہ وہ لا الہ کا تو قائل تھا لیکن الا اللہ سے محروم، اس کے بعد شاعر بہشت کے احوال بیان کرتا ہے، جنت کے جمال و جلال، شان و شوکت، آرائش و زیبائش نے اقبال کو مسحور کر دیا، رومی شاعر کو جھنجھوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ جو تم رنگ رنگ اور ڈھنگ ڈھنگ کے قصر دیکھ رہے ہو اس کی بنیاد خشت و سنگ پر نہیں بلکہ اعمال پر ہے، اچھے کام اور عبادات اپنی تجلی سے بہشت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جس کو اہل دنیا نے کوثر، حور اور غلمان کا نام دے رکھا ہے، اس کے بعد شاعر بہشت کے مختلف محلوں اور ان کے مکینوں کا ذکر انتہائی دل کش انداز میں کرتا ہے جن میں سب سے پہلے شرف النساء کا ذکر آتا ہے، یہ پنجاب کے عبد الصمد کی بیٹی تھی، ان کی زندگی سراپا شوق و ذوق تھی، وہ ہمیشہ قرآن میں محو رہتی تھی اور کمر میں ایک شمشیر لٹکتی رہتی تھی، انہوں نے وصیت کی تھی کہ انہیں تیغ و قرآن کے ساتھ دفن کیا جائے، کیوں کہ یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی محافظ اور زندگی کی محور ہیں، اس کے بعد اقبال نے کشمیر کے متعدد شعرا کا ذکر کیا جو کشمیر کی غلامی اور کسمپرسی پر نوحہ کناں ہیں، پھر قدیم شاعر بھرتری، فاتح نادر شاہ اور احمد شاہ کا ذکر بھی ہوتا ہے، مغربی تقلید اور فرنگیوں کی غلامی پر شدید نفرت و حقارت کا اظہار بھی ہوتا ہے، اس کے بعد شہید ٹیپو سلطان کا تذکرہ

تفصیل سے ہوتا ہے جس میں اس کی شجاعت، قوت اور حب الوطنی کا جذبہ کارفرما ہے، شہادت کا جذبہ اور زندگی کے فلسفہ کے پس منظر میں شاعر ٹیپو پر اس طرح تبصرہ کرتا ہے:

آن شہیدان محبت را امام　　　آبروئے ہند و چین و روم و شام

نامش از خورشید و مہ تابندہ تر　　　خاک قبرش از من و تو زندہ تر

جب شاعر ٹیپو سے ہم کلام ہوتا ہے تو وہ زندگی اور موت پر نہایت سبق آموز فلسفہ پیش کرتا ہے، وہ انقلاب کو زندگی کا سرمایہ اور تغیر و سفر کو زندگی کا اٹل قانون تصور کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ مردوں کی شان آسمان کی وسعتوں میں مہر جہاں تاب کی طرح چمکنا ہے، زندگی شاہین کی طرح جینے اور عقاب کی طرح جھپٹنے کا نام ہے، اس کے بعد اقبال نے سلطان شہید کا یہ مشہور قول دہرایا:

زندگی را چیست رسم و دین و کیش　　　یک دم شیری بہ از صد سالِ میش

ٹیپو کی مجاہدانہ فکر بار بار شہادت کو انتہائے راہ شوق کا نام دینے پر مجبور ہوتی ہے:

آں دگر مرگ انتہائے راہ شوق　　　آخریں تکبیر در جنگاہ شوق

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر　　　مرگ پور مرتضی چیزی دگر

اور آخر میں جہاد کے فلسفہ پر یوں گویا ہے:

جنگ مومن چیست ہجرت سوئے دوست　　　ترکِ عالم اختیارِ کوئے دوست

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را　　　کو بخون خود خرید ایں نکتہ را

شہید ٹیپو کی ان باتوں کو سن کر شاعر پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس حالت میں وہ بہشت سے رومی کے ساتھ رخصت ہوتا ہے:

کتاب کے آخر میں ”خطاب بہ جاوید سخنے بہ نژاد نو“ کے عنوان سے شاعر مشرق نے اپنے بیٹے سے خطاب کیا، دراصل یہ خطاب پوری نسل سے ہے، انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں زندگی کے تمام گوشوں کو منور کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ نئی نسل ایمان و یقین سے بہرہ ور ہو کر رسم کہن کے تار و پود کو بکھیر دے، ظلم و جبر کا خاتمہ ہو اور ایک جہان تازہ پیدا ہو جس میں حرکت و حرارت، پاکیزگی و پرہیزگاری، صدق و صفا اور سوز و شوق کی حکمرانی ہو جس کی آغوش میں پل کر ہماری نسل، ستاروں پر کمند ڈال سکے، تاکہ صنم پرستی اور صنم فروشی کا خاتمہ ہو، ان الفاظ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صرف جاوید سے خطاب ہی نہیں بلکہ پیغام عمل کا ایک نصاب بھی ہے:

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات　　　تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

اخبار علمیہ

مدینہ ریسرچ اینڈ اسٹڈی سنٹر کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عبدالباسط بدر نے اعلان کیا ہے کہ مدینہ منورہ اور سیرت نبوی ﷺ پر ایک دستاویزی فلم تیار کی جارہی ہے اور اس پر بہت تیزی سے کام بھی شروع ہوگیا ہے، تاریخی ثبوتوں اور مستند رپورٹوں کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے ۴۳ مسجدوں میں نمازیں ادا کی تھیں جن میں مسجد نبوی، مسجد قبا، مسجد الاجابہ اور مسجد قبلتین ہی دست برد زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہیں، سنٹر نے ابھی حال ہی میں عہد نبوت وسیرت کے متعلق ایک نمائش کا بھی اہتمام کیا تھا جو بڑی معلومات افزا ہے۔

کویت کی وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ کے ترجمان ''الوعی الاسلامی'' کا شمارہ فروری ۲۰۰۷ء موصول ہوا تو اس کے ساتھ ایک پوسٹر بھی منسلک تھا جس میں دولت عثمانیہ[1] کے متعلق گوناگوں مفید معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں، مثلاً ۳۶ فرماں رواؤں کے مختصر سوانح زندگی، ملکی فتوحات، بغاوتیں اور دوسری سرگرمیاں درج کی گئی ہیں، سلاطین دولت عثمانیہ کے تذکرے کے بعد آخر میں فتح قسطنطنیہ، یہودیوں کے سلسلہ میں سلطان عبدالحمید کا موقف، مشہور مساجد، عثمانی طرز تعمیر اور عثمانی میوزیم کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں، غرض اپنی نوعیت کا یہ منفرد پوسٹر تاریخ دولت عثمانیہ سے دل چسپی رکھنے والوں کے لئے مفید اور دل چسپ ہے۔

دی ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ اور انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی، ملیشیا نے اس معاہدے پر دستخط کئے ہیں کہ وہ عالم اسلام کے طلبہ کو اسکالرشپ مہیا کریں گے، اسلامی تہذیبی پروگراموں میں تعاون کریں گے، رپورٹ کے مطابق یہ معاہدہ پورے مسلم معاشرہ میں بیداری لانے اور انٹرنیٹ اور میڈیا کے ذریعہ تہذیبی اور سائنسی میدانوں میں بھی معاون ہوگا۔

[1] شش صدی تک یورپ ایشیا اور افریقہ پر فرماں روائی کرنے والی۔

برطانوی گورنمنٹ نے کہا کہ گذشتہ برس جامعہ اسلامیہ اسکول'' پر پولس نے ''انسداد دہشت گری آپریشن'' کے تحت دھاوا بول دیا تھا، یہ غیر سرکاری اسکول انگلینڈ کے جنوب مشرقی علاقہ ''مارک کراس'' میں واقع ہے چوں کہ اسکول وزارت تعلیم کے مطلوبہ مقاصد کا حامل نہ تھا، اس لئے اس کو بند کردیا گیا اور وزارت تعلیم کا کہنا ہے کہ معینہ معیار کی شرط پوری کئے بغیر اسے کھولنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

''ہسٹری آف دی آٹومن اسٹیٹ اینڈ سیویلائزیشن'' کا روسی ایڈیشن، ماسکو سے شائع ہوا ہے، یہ ایڈیشن اوریجنل کتاب کا دو جلدوں میں ترجمہ ہے جو عہد عثمانیہ کے حقیقت پسندانہ مطالعہ وتجزیہ پر مشتمل ہے اور جس میں زیادہ تر اس سلسلہ میں کی جانے والی ابتدائی تحقیقات اور تاریخی دستاویزات کو ماخذ بنایا گیا، اس کا پہلا ایڈیشن ۹۷-۱۹۹۴ء میں ترکی زبان میں شائع ہوا، اس کے بعد عربی اور انگریزی ایڈیشن منظر عام پر آئے، بوسینیائی زبان میں اسے ۲۰۰۵ء میں منتقل کیا گیا، ان زبانوں کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی اس کے ترجمے کے منصوبے بنائے گئے ہیں، اس کی رسم اجرا کی تقریب ۵/جون ۲۰۰۶ء کو ماسکو اسٹیٹ یونی ورسٹی میں منعقد ہوئی، اس موقع پر OIC کے جنرل سکریٹری جو اس کے اصل مدیر بھی ہیں موجود تھے، ان کے علاوہ صدر روس ولادیمیر پوتن کے مشیر، صدر تاتارستان کے مشیر اور دوسرے تاریخ کے ماہرین اور اعلا مناصب پر فائز حکام کی موجودگی نے اس باوقار تقریب کی رونق بڑھائی، اس کا افتتاح پروفیسر مائیکل میٹر ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف رشین اینڈ افریقن اسٹڈیز نے کیا جو اس روسی ایڈیشن کے مدیر اعلا ہیں، پروفیسر اکمل الدین احسان اوغلو نے حاضرین کو طریقہ کار اور کتاب کی دوسری خصوصیات سے آگاہ کیا، ارسکا کے موجودہ ڈائریکٹر نے کہا کہ اس روسی ایڈیشن کے نتیجہ میں ارسکا اور روس کے اکیڈمک دائرہ عمل میں ترقی کے امکانات وسیع ہوں گے۔

امریکہ کی نیویارک یونی ورسٹی کے بعض طلبہ نے ایک خاص قسم کا سافٹ ویر تیار کیا ہے جس کے ذریعہ پودے اپنے مالیوں کو فون کے ذریعہ اپنی حاجت سے باخبر کرسکتے ہیں، اس ٹیکنک کا نام انہوں نے ''باٹنی کالس'' رکھا ہے، انہوں نے پودوں میں مائیکروکنٹرولر لگایا ہے جس

کا ایک خاص نمبر ہے، اس نمبر کو سیل فون پر ڈائل کرنے کے بعد ان کی کھاد، پانی اور خشکی وتری کا پورا اندازہ لگایا جاسکتا ہے یا ان سے بات چیت ہوسکتی ہے لیکن رپورٹ میں تخاطب کی اصل نوعیت کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی ہے، رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس سافٹ ویر ٹیکنک نے انسانوں اور پودوں کے درمیان باہمی رابطے کا نیا دروازہ کھولا ہے، سائنس دانوں کے بہ قول "اس پروجیکٹ سے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انسانوں اور نباتات میں حیاتی طور پر کس قسم کے رشتے قائم ہوسکتے ہیں"۔

مصر کے ایک جج کے حوالہ سے یہ بات کہی گئی ہے کہ عورتیں منصب قضا پر فائز نہیں ہوسکتیں کیوں کہ یہ شریعت کے خلاف ہے، گو کہ وہ تنہا مردوں کے ساتھ مل کر کام کرسکتی ہیں، عرب ممالک میں مصر ہی وہ پہلا ملک ہے جس نے ۱۹۵۶ء میں ہی عورتوں کو حق رائے دہی دے دیا تھا، تاہم متعدد دہے گزرنے کے باوجود وہاں قدامت پسندی کے رجحانات کی حامل عورتوں کی تعداد زیادہ ہے اور عوامی سطح پر ان کی ترقی کی رفتار بھی بہت سست ہے۔

الکندی پرائیویٹ ہائی اسکول جو فرانس کے صوبہ لیون کے مشرقی نواحی بستی "ڈیسائنس" میں واقع ہے، گو اسے لیون ایجوکیشن بورڈ کے ایک فیصلے کے بعد بند کردیا گیا تھا، چارج شٹ یہ تھی کہ حفظان صحت کے لحاظ سے اسکول کی حالت اطمینان بخش نہیں ہے، مگر ایک مہینے کی سخت جد وجہد کے بعد فرنچ ہائر ایجوکیشن کونسل کی اجازت سے دوبارہ کھولا گیا ہے، مسلمانوں میں اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا گیا ہے، رپورٹ کے مطابق اس اسکول کو مشہور مسلم فلاسفر یوسف یعقوب ابن اسحاق الکندی (۸۰۱ھ-۸۷۳ھ) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے، اس میں صوبائی نصاب تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن مجید، قوانین، تہذیب اسلامی اور تاریخ کی تعلیم بھی ہوتی ہے، اس اسکول کا سالانہ خرچ ۷ لاکھ یورو ہے۔

ک۔ ص۔ اصلاحی

☆☆☆☆☆

معارف کی ڈاک

پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کی خدمت میں

گیان پور، بھدوہی
اپریل ۲۰۰۷ء

جناب مولانا صاحب دام ظلکم،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف اپریل ۲۰۰۷ء میں "مکاتیب سلیمانی" بہ نام مولانا محمد ظفر الدین قادری کے شروع میں علی گڑھ کی جو تعارفی تحریر شائع ہوئی ہے اس میں وہ سید صاحب کے مضامین "واقدی اور مستشرقین (جنوری ۱۹۲۶ء) اور پھر واقدی" (جنوری ۱۹۲۷ء) کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

"کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ سید صاحب کے اس مضمون پر مولانا (ظفر الدین قادری) نے انہیں ایک خط لکھا تھا جسے سید صاحب نے معارف کے ایک شمارے میں شذرات میں چھاپ دیا تھا"۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ جون ۱۹۲۷ء کے شذرات میں مولانا محمد ظفر الدین قادری صاحب کا خط اور اس کا جواب شائع ہوا ہے جواب "شذرات سلیمانی جلد دوم" کے صفحات ۱۲۸ تا ۱۳۲ پر بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، یہ خط تو صرف ضابطہ کی رسید اور مختصر ہے، تاہم اس سے اور جواب سے دونوں کے نظریات کی وضاحت ہوتی ہے۔

شذرات میں ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر بہت افسوس ہوا، امید ہے کہ آپ اور دار المصنفین کے تمام لوگ بخیر ہوں گے۔

والسلام

شاہ ظفر الیقین

مطبوعات جدیدہ

بھوپال میں اردو، انضمام کے بعد: از ڈاکٹر محمد نعمان خاں، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۳۲، قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی نمبر ۶ - اور مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر نئی دہلی اور بھوپال کے مکتبے۔

دارالاقبال اور شہر جلال و جمال، بھوپال کے متعلق بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ سیاسی اور عسکری سے زیادہ اس شہر نے مذہبی اور علمی لحاظ سے شہرت اور نیک نامی حاصل کی، ہندوستان کے وسط میں خوش نما اور سرسبز پہاڑوں اور وادیوں کے درمیان واقع اس شہر اور ریاست کی تاریخ گو ہندوستان کے اور علاقوں کی طرح قدیم ہے لیکن اس کی ممتاز و مستقل شناخت سترہویں صدی کے اواخر میں اس وقت قائم ہوئی جب یہاں ایک حوصلہ مند اور جری افغان سردار دوست محمد خاں نے اپنے قدم جمائے اور مغلیہ حکومت کے دور زوال میں یہاں ایک خود مختار ریاست قائم کی، قریب ڈھائی سو سال تک اس افغان نژاد ریاست میں علم و فن کی قدر افزائی ہوتی رہی، حکمراں خود صاحب ذوق تھے، اردو ادب اس وقت شاعری سے عبارت تھا، قاضی محمد صالح جو اٹھارہویں صدی کے آغاز میں تھے، یہاں کے پہلے شاعر بتائے جاتے ہیں، یکم جون ۱۹۴۹ء میں جب ریاست کا انضمام حکومت ہند میں ہوا، اس وقت تک بھوپال علم و ادب میں درجہ کمال پر پہنچ چکا تھا، اس داستان کی ایک جھلک برسوں پہلے ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے اپنی کتاب "اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" کے ذریعہ پیش کی، زیرنظر کتاب میں اس داستان کے دوسرے حصے یعنی آزادی کے بعد کی تفصیل ہے اور یہ ۱۹۸۵ء یعنی قریب چھتیس سال کی سرگرمیوں کو شامل ہے، لائق مصنف کا نام ادب خصوصاً بھوپالیات میں معروف ہے اور مستند و معتبر بھی ہے، یہ کتاب بھی ان کی تحقیقی اور تصنیفی اور تنقیدی صلاحیت کی سند ہے جس میں انہوں نے سات ابواب میں اردو نثر اور نظم کے تمام اصناف کے علاوہ صحافت، تعلیم و تدریس اور اردو کی بقا و ترقی میں سرگرم انجمنوں اور تحریکوں کی بڑی جامع اور مکمل تصویر پیش کردی ہے، شروع کے دو ابواب میں ریاست کے خاتمے تک بھوپال کی تاریخ کے ساتھ اردو کی تاریخ کا بھی ایک مفید جائزہ لیا گیا ہے، آزادی سے پہلے کے خوش گوار ماحول اور ریاست کے خاتمے کے بعد کے نامساعد حالات کے

باوجود بھوپال نے جس طرح اردو زبان و تہذیب کو سینے سے لگائے رکھا اور اردو کے حسن و افادیت اور مقبولیت کو برقرار رکھا وہ یقیناً لائق ستائش ہے، لائق مصنف نے حتی الامکان مکمل استیعاب کی کوشش کی ہے، مثلاً صحافت کے باب میں انہوں نے انضمام ریاست کے بعد کے تمام رسائل و جرائد اور وابستگان صحافت کا ذکر کیا ہے لیکن اس میں تاج المساجد کے ترجمان پندرہ روزہ نشان منزل اور اس کے مدیر غضنفر علی خاں کا نام رہ گیا ہے روزنامہ الحمراء اور محمود الحسینی کے ساتھ مشرف الحسینی کا ذکر بھی ہونا چاہیے، تصنیف و ترجمہ کے سلسلے میں مولانا حبیب ریحان خاں ندوی اور منصور نعمانی مرحوم کا ذکر ضروری تھا، شعرا میں شرقی خالدی اور عثمان یمانی اور مولانا محمد عمران خاں ندوی اور ان کی مشہور تالیف محسن کتابیں کا ذکر ہونا چاہیے تھا، کتابت اعلا درجہ کی ہے لیکن سہو کا نہ ہونا ناممکن ہے، علامہ شبلی کا رسالہ بدء الاسلام "بدر الاسلام" ہوگیا ہے، لائق مصنف کا یہ جذبہ قابل قدر ہے کہ اب مستقبل میں اردو زبان و ادب کا انحصار آنے والی نسل پر ہے اور اس کے لئے اردو کے ہر بہی خواہ کو اپنا فرض نبھانا چاہیے۔

حیدرآباد، ماضی کے جھروکوں میں: از جناب خواجہ معین الدین عزمی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۸۴، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: سیل کاؤنٹر، روزنامہ سیاست، حیدرآباد اور حیدرآباد کے دوسرے مشہور مکتبے۔

فرخندہ بنیاد و سرمایۂ ایجاد شہر حیدرآباد میں قرطبہ و غرناطہ اور بغداد و دمشق کی افسانوی لذت کی طرح یہ احساس الم بھی ہے کہ اس شہر کی خاک کبھی گردوں پایہ تھی اور اب اس کی یاد ایک برگشتہ قوم کا سرمایہ ہے، جس کے چپہ چپہ پر تہذیب و تمدن کے مزار ہیں لیکن اس کی تعمیرات کا ہر نقش ایک پیغام اور ایک روایت کی صدا بھی دیتا ہے، اس مجموعہ بلکہ حیدرآباد کی یادوں کو سمیٹنے والے مرتب امریکا میں رہ کر حیدرآباد کی ہر یاد سے اپنی دنیا آباد کیے ہوئے ہیں، ان کے طویل اور لذیذ مقدمے کا پہلا جملہ ہی یہی ہے کہ "حیدرآباد وہ شہر ہے جس کی بنیاد محبت پر رکھی گئی اور اسے عشق نے پالا پوسا"، اس جملہ اور جذبہ کی صداقت کے ثبوت میں انہوں نے اپنے شہر کے تعلق سے پچاسوں مضامین اور نظموں کا انتخاب دو حصوں میں اس طرح کیا کہ پہلا حصہ قطب شاہی اور دوسرا حصہ آصف جاہی دور کی نذر کردیا، مقدمے میں انہوں نے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے نام نظام سابع میر عثمان علی خاں کے اس خط کا ذکر بھی کیا جس کے متعلق حضرت سید صاحب نے لکھا تھا کہ "یہ دارالمصنفین کے تاریخی نوادر میں شامل ہوگا اور آئندہ نسلوں کو شاہان اسلام کی علم نوازی کا نمونہ دکھاتا رہے گا"، فاضل مرتب نے بجا طور

پرتوجہ دلائی کہ" نظام سابع نے شاید ہی کسی کو نجی خط اپنے دست مبارک سے لکھا ہو اور لفافہ پر اپنے قلم سے پتہ بھی" اور یہ اہتمام اس لئے ہوا کہ یہ رسالہ شاہانہ، ذات قدسی صفات سرور کائنات ﷺ کی سیرت طیبہ کے تعلق سے تھا، اس کتاب کے تمام مضامین اس لحاظ سے بھی بیش قیمت ہیں کہ اب ان میں سے اکثر کا علم لوگوں کو نہیں، ان میں نصف سے زیادہ مضامین پروفیسر سید مبارز الدین رفعت مرحوم نے جمع کیے تھے، وہ اپنی زندگی میں اس مجموعہ کو شائع نہیں کر سکے، اس کتاب کے فاضل مرتب نے اس کو حاصل کیا اور دوسرے مضامین کے اضافے کے ساتھ اس کو شائع کر کے حیدرآباد اور اس کے نیک نام اول و آخر والی و سلطان کے دربار میں یہ کہہ کر نذر کیا کہ" ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما" کتاب میں جوش ملیح آبادی کی پانچ تحریریں بھی ہیں، ان کی شمولیت کے باب میں باوجود اس احساس کے کہ یادوں کی برات میں جوش نے حیدرآباد کے احسانات کا بدلہ احسان ناشناسی سے دیا، یہ کہنا خوش مذاقی کی دلیل ہے کہ" بہرحال ہمیں تو پھول چننا ہے" حیدرآباد کی تاریخ، بے مثل عمارتوں اور تہذیب و معاشرت اور علوم و فنون کی گرم بازاریوں کو محسوس کرنے کے لئے یہ کتاب کسی نادر سوغات سے کم نہیں۔

اردو ادب کی تدریس اور ترویج میں شعبہ اردو گلبرگہ یونی ورسٹی کا حصہ:

از ڈاکٹر معین منظر گلبرگوی، متوسط، کاغذ عمدہ، صفحات ۱۱۲، قیمت ۸۰ روپے، پتہ: مکتبہ رفاہ عام، نزد درگاہ حضرت خواجہ بندہ نواز، گلبرگہ، کرناٹک۔

اردو کی خدمت کے جو مرکز آج سرگرم عمل ہیں ان میں گلبرگہ یونی ورسٹی کا شعبۂ اردو بھی ہے، گلبرگہ کبھی اسلامی ہند کی عظمت کا سب سے نمایاں نشان تھا، ریاست حیدرآباد کے ایک مرکزی شہر ہونے کی وجہ سے یہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا مرکز اور بہ قول لائق مصنف "علمی و ادبی روایت کا پاسبان اور پاسدار رہا" مصنف خود بھی اس شہر کی تہذیب کے نمائندہ ہیں، انہوں نے شہر اور اردو سے تعلق کی بنا پر شعبہ اردو کی مختصر تاریخ اور پھر اردو کے نصاب کے علاوہ اساتذہ کی علمی و ادبی خدمات کا ذکر کیا، ڈاکٹر طیب انصاری سے محترمہ خدیجہ ناز تک چند نام ور اساتذہ کے بارے میں یہ اطلاعات مشکل سے کہیں اور ملتیں، شعبہ اردو کے تحقیقی مقالات کی تفصیل اور اس کی اشاعتی سرگرمیوں کا ذکر بھی ہے، کتاب مختصر ہے لیکن سلیقے سے ہے۔

ع-ص

☆☆☆